معارف

جولائی ۲۰۱۹ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰؍روپئے۔ فی شمارہ ۲۵؍روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴؍روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰؍روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰؍روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Office Mobile) 09170060782

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری؍منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۴ | ماہ ذی قعدہ ۱۴۴۰ھ مطابق ماہ جولائی ۲۰۱۹ء | عدد ا

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

کتنی طویل مدت گزر گئی جب مصری فوج کے ظالم اور سنگ دل جنرلوں نے ایک فوجی انقلاب کے ذریعہ اقتدار پر قبضہ کرلیا تھا۔اس طویل عرصہ میں کلمۂ حق بلند کرنے والوں کے سروں سے اتنی بار موج بلا گزر چکی ہے کہ اس کا شمار بھی مشکل ہے۔ستر سال پہلے ۱۹۴۹ء میں اخوان کے بانی اور پہلے مرشد عام حسن البناء شہید جب فوج کی سیکرٹ سروس کے ہاتھوں قتل کردیے گئے تو عہد حاضر میں سب سے بڑی اسلامی جماعت کے بانی اور مؤسس کا جنازہ اس شان سے اٹھا کہ گاؤں میں کرفیو نافذ تھا،بوڑھے باپ نے غسل دیا،والد،پھوپھی،بہن اور چھوٹا بیٹا جنازہ قبرستان لائے اور ان کی تدفین کا فریضہ انجام دیا۔ ۱۷؍جون کو اسی مصری فوج نے مصر کی تاریخ کے پہلے منتخب صدر ڈاکٹر محمد مرسی کو قتل کردیا۔ان کی موت فطری نہیں تھی بلکہ یہ دراصل قتل تھا۔گذشتہ چھ سال سے ان کو جن حالات میں رکھا گیا اور جس طرح ان کو طبی اور دوسری بنیادی سہولیات سے محروم رکھا گیا تھا وہ دراصل ان کے قتل ہی کا پروسس تھا جس کا انجام یہی ہونا تھا۔ان کا انتقال عدالت میں ہوا۔انتقال سے پہلے اپنے شیشے کے پنجرے سے انہوں نے جو بیان دیا تھا اس کو دنیا بھر میں لوگوں نے دیکھا اور سنا۔ایمان واذعان سے سرشار لہجہ میں وہی جذبہ سرفروشی تھا؛باطل کے سامنے وہی غیر متزلزل استقامت،کہیں سے کسی کمزوری کا کوئی شائبہ نہیں۔صحت سے متعلق بہت سے مسائل کے باوجود نہ تو انہوں نے کسی رعایت کی درخواست پہلے کی تھی اور نہ اب۔پھر وہ شیشے کے اسی پنجرے میں گر گئے۔انہیں فوری طور پر کسی طرح کی کوئی طبی امداد نہیں پہونچائی گئی اور نہ اسپتال لے جایا گیا۔کم از کم بیس منٹ تک وہ اسی حالت میں پڑے رہے۔جن لوگوں کو طبی معاملات میں کچھ زیادہ درک نہیں وہ بھی اس بات سے واقف ہیں کہ ایسے حالات میں فوری طبی امداد کی کیا اہمیت ہے۔وہاں موجود سرکاری عملہ اس طرح اس بات کو یقینی بنا رہا تھا کہ ان کے بچنے کا کوئی امکان باقی نہ رہ جائے۔چنانچہ یہ ایک قتل کا معاملہ ہے۔فوجی ڈکٹیٹر کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ عوامی جنازہ کی اجازت دی جاتی۔رات کی تاریکی میں فوجی بندوبست میں ان کو دفن کردیا گیا اور اہل خانہ میں سے بھی صرف چند کو شرکت کی اجازت ملی۔

مصر کی جدید تاریخ میں وہ پہلے منتخب صدر تھے۔صدارت کے عہدے کے لیے ان کا انتخاب اور ان کا مختصر دور حکومت مصر کے عوام کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا،ایک ایسی امید جس کی آرزو بھی ان کے سینوں میں دم توڑ چکی تھی۔ایک طویل شب غم کے بعد صبح امید،متعفن اور گھٹے ہوئے ماحول میں تازہ ہوا کا ایک جھونکا،ان کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر۔جس انداز اور آہنگ سے انہوں نے اپنا مختصر دور صدارت گزارا اس نے کتنے دلوں میں مستقبل کے حوالے سے خوشگوار امکانات کا چراغ روشن کردیا تھا۔مصر کی فضاؤں میں تبدیلی کی آہٹ کو صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔افسوس خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود۔یہ بات

وہاں کے مقتدر طبقات کو جن کے ہاتھ میں طویل عرصہ سے زمام اختیار تھی گوارا نہ تھی۔ مصر سے باہر بھی بہت سے ارباب اقتدار کو وہاں اس نئے نظام کی کامیابی ناقابل برداشت تھی اس لیے کہ یہ ان کے اپنے نظام کے اختتام کی نوید ہوتی۔ عالم عرب کے بادشاہوں کے لیے مصر میں جمہوریت کی کامیابی ایک ڈراؤنے خواب سے کم نہ تھی۔ یہ سب کچھ ڈاکٹر مرسی کے لیے ایسی سد راہ بن گیا جس کا عبور کرنا ممکن نہیں رہا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ حکومتی مشینری کا تعاون بھی ان کو حاصل نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کی تاریخ کا یہ عظیم تجربہ ناکام ہو گیا اور پھر ظلم و جبر کی وہی ختم نہ ہونے والی شب تاریک واپس آ گئی اور اپنی تمام تر شدت کے ساتھ ابھی جاری ہے۔ اس فوجی حکومت نے مصری عوام بالخصوص مذہبی طبقات اور اخوان کے بہی خواہوں اور ہمدردوں کے ساتھ جو کچھ کیا وہ اس سے پہلے کی بدنام زمانہ حکومتیں بھی نہیں کر سکی تھیں۔ قتل، حبس، ایذا دہی کے سارے پرانے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ سلسلہ کب ختم ہوگا اور مصریوں کو اس نامسعود حکومت سے کب نجات ملے گی۔

رجب طیب اردوان کے سیاسی عروج کی ابتدا ۱۹۹۴ء میں ہوئی جب وہ استانبول کے میئر کے عہدہ کے لیے منتخب ہوئے۔ پھر انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور ایک کامیابی سے دوسری کامیابی کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ نجم الدین اربکان کے زیر سایہ تربیت حاصل کی۔ بعد میں ان سے علاحدہ ہو کر جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی کی تاسیس کی اور گزشتہ سترہ سال سے عملاً ملک کی زمام اقتدار ان کے ہاتھ میں ہے، پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے اور اب صدر مملکت کی حیثیت سے۔ انہوں نے ترکی کے لیے بہت کچھ کیا۔ ترکی کی غیر معمولی معاشی ترقی اور اقوام عالم کے درمیان ترکی کو جو مقام حاصل ہے اس کے معمار وہی ہیں۔ اس وقت عالم اسلام کے وہ سب سے قدآور لیڈر ہیں۔ ملت کی فلاح و بہبود کے لیے فکرمند بھی رہتے ہیں اور اس کے لیے بڑی سے بڑی طاقتوں کی مخالفت مول لینے سے گریز نہیں کرتے۔ ملی مسائل میں دلچسپی اور ملی غیرت مندی کے معاملہ میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ ترکی ایک جمہوری ملک ہے اور جمہوری اصول حکومت کے مطابق طاقت کا اصل سرچشمہ ملک کے عوام ہوتے ہیں۔ بعض عوامی فیصلے ایسے ہوتے ہیں جن کا پہلے سے اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ترکی کو گذشتہ دنوں ایسے ہی ایک غیر متوقع تاریخی لمحہ کا سامنا کرنا پڑا جب عوامی فیصلہ توقعات کے یکسر خلاف تھا۔ مئی میں منعقد ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں حزب مخالف کے زیر قیادت متحدہ محاذ اتحاد ملت نے ترکی کے تین سب سے بڑے شہروں میں آق پارٹی کو شکست دے دی۔

یہ بلدیاتی انتخابات تھے اور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں کامیابی یا ناکامی کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ نہیں ہے جس سے ملک کے مستقبل کے امکانات کا اندازہ لگایا جا سکے۔ لیکن بہت سے لوگ اسے غیر معمولی اہمیت دے رہے ہیں اور اسے صدر اردوان کے زوال کا نقطہ آغاز تصور کرتے ہیں۔ عالم اسلام

کے معاملات اور بین الاقوامی امور میں ان کا جو موقف رہا ہے اس کی وجہ سے ان کے زوال کی تمنا کرنے والوں کی تعداد کم نہیں۔ بہر حال بالخصوص استانبول کے تعلق سے جو صورت حال پیش آئی ہے وہ صدر اردوان اور آق پارٹی کے لیے یقیناً باعث تشویش ہے۔ استانبول آق پارٹی کا گڑھ مانا جاتا رہا ہے اور گذشتہ پچیس سال سے اس کا کنٹرول ان کے ہاتھ میں رہا ہے۔ مئی میں جو بلدیاتی انتخابات ہوئے ہیں ان میں استانبول سمیت ملک کے تین سب سے بڑے شہروں میں حزب مخالف نے کامیابی حاصل کی۔ استانبول میں متحدہ اپوزیشن کے امیدوار اکرم امام اوغلو نے کامیابی حاصل کی۔ اس عہدہ کے لیے آق پارٹی کے امیدوار بن علی یلدرم تھے جو صدارتی نظام کے نفاذ سے پہلے ترکی کے وزیر اعظم تھے۔ بعد میں پارلیمنٹ کے اسپیکر بھی رہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آق پارٹی کے نزدیک یہ انتخابات کتنے اہم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ الیکشن فریقین کے لیے وقار کی جنگ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ استانبول میں اپوزیشن کی کامیابی کا فرق کچھ زیادہ نہیں تھا۔ شاید اسی وجہ سے آق پارٹی نے اسے چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا۔ الیکشن کمیشن نے استانبول میں دوبارہ الیکشن کرانے کا فیصلہ کیا۔ دوبارہ الیکشن ہوا اور اس کے نتائج آق پارٹی کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ تباہ کن ثابت ہوئے۔ پہلے فریقین کے درمیان جو فرق ہزاروں تک محدود تھا وہ بڑھ کر لاکھوں تک پہونچ گیا۔ امام اوغلو نے ۵۴ فیصد ووٹ حاصل کیے جب کہ بن علی یلدرم صرف ۴۵ فیصد ووٹ حاصل کر سکے۔ دوبارہ الیکشن کا مطالبہ کر کے آق پارٹی نے ایک بڑی سیاسی غلطی کی۔ واضح طور پر وہ زمینی صورت حال کے ادراک سے قاصر رہی۔

اس سے آق پارٹی کا جو خسارہ ہوا وہ تو ظاہر ہے۔ البتہ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ دنیا کے سامنے یہ حقیقت کھل کر آ گئی کہ ترکی میں جمہوریت موثر طور پر کام کر رہی ہے اور الیکشن کا نظام پوری طرح شفاف ہے۔ مغربی میڈیا اور مخالفین نے ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے صدر اردوان کی جو شبیہ پیش کی تھی وہ یکسر غلط ہے۔ بہر حال اس امر میں شبہ کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے کہ اس وقت ترک عوام کا ایک طبقہ حکومت کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہے۔ حکومت کو بے اطمینانی کے اسباب کا پتہ لگانا ہوگا اور ان کا ازالہ کرنا ہوگا۔ گذشتہ کچھ عرصہ سے ترکی کی معیشت سخت دباؤ میں ہے اور ملک کا مڈل کلاس اس سے بری طرح متاثر ہوا ہے۔ وزیر خزانہ کی حیثیت سے اس صورت حال سے نمٹنے اور ملک کو معاشی بحران سے نکالنے کی ذمہ داری صدر اردوان نے اپنے داماد برات البائرک کو دے رکھی ہے۔ بہت سے لوگ اس سے مطمئن نہیں ہیں۔ آق پارٹی کو یہ وارننگ ایسے وقت ملی ہے جب آئندہ چار سال تک ملک میں کوئی الیکشن نہیں ہونے والے ہیں۔ چنانچہ صدر اردوان اور آق پارٹی کے پاس وقت ہے کہ وہ پوری سنجیدگی اور معروضیت سے ان اسباب و علل کا پتہ لگائیں جو ان حالات کے لیے ذمہ دار ہیں اور ان کا مناسب انداز میں تدارک کر کے عوام کے اعتماد کو پھر سے حاصل کریں۔

مقالات

قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج
حقوق و فرائض کی اہم دستاویز

ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی

قاضی ابو یوسف کا تعارف: عباسی عہد میں اصحاب علم نے اسلامی علوم کے میدان میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ اسی زمانہ میں امام ابو حنیفہ کے ممتاز شاگرد قاضی ابو یوسف نے بھی اپنی گراں قدر علمی خدمات کا لوہا منوایا ہے۔ ابتدا میں ان کا میلان حدیث کی طرف زیادہ رہا، اسی شوق کی وجہ سے ابن ابی لیلیٰ کے حلقہ درس میں شرکت کی۔ ابن ابی لیلیٰ حدیث کے ساتھ ساتھ فقہ پر بھی توجہ دیتے تھے (۱) نو برس تک ان سے کسب فیض کے بعد امام ابو حنیفہؒ کے درس میں شریک ہوئے اور آخر تک امام ابو حنیفہ کے درس سے ہی علمی پیاس بجھاتے رہے۔

تیسرے عباسی خلیفہ المہدی (۱۵۸-۱۶۸) نے ان کو ۱۶۶ھ میں بغداد کے مشرقی حصہ کا قاضی مقرر کیا۔(۲)

قاضی ابو یوسف کا سب سے بڑا کارنامہ فقہ کی تدوین و ترتیب ہے اس کے علاوہ امام ابو حنیفہ کے مکتب فقہ کو تکمیل و استحکام اور فقہ حنفی کی ترویج میں بھی انہوں نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی علمی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بہت اہم اور قیمتی کتابیں تصنیف کی تھیں۔ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں قاضی ابو یوسف کی درج ذیل کتابوں کے نام لکھے ہیں: کتاب الصلاۃ، کتاب الزکاۃ، کتاب الصیام، کتاب الفرائض، کتاب البیوع، کتاب الحدود، کتاب الوکالۃ، کتاب الوصایا، کتاب الصید والذبائح، کتاب الغصب والاستبرا اور امالی جسے بشر بن ولید نے روایت کیا ہے جو ۳۶ کتابوں کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح کتاب اختلاف الامصار،

☆ پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلو، شعبۂ دینیات سنّی، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ۔ Email: zafardarik85@gmail.com

کتاب الرد علی مالك بن انس، رسالۃ فی الخراج الی الرشید، کتاب الجوامع جسے یحییٰ بن خالد نے مرتب کیا ہے۔ یہ چالیس کتابوں پر مشتمل دستاویز ہے۔ اس میں قاضی ابو یوسف نے فقہا کے درمیان اختلافات اور مختلف فیہ مسائل میں ترجیحات کا تذکرہ کیا ہے۔(۳) قاضی ابو یوسف کا جو تصنیفی سرمایہ اس وقت دستیاب ہے وہ درج ذیل ہے: کتاب الآثار (۴) الرد علی السیر الاوزاعی (۵) کتاب اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلی (۶) کتاب الحیل بھی امام ابو یوسف کی طرف منسوب کی جاتی ہے (۷) اور کتاب الخراج۔ قاضی ابو یوسف کے علمی منصب کا اعتراف بڑے بڑے علماء نے کیا ہے۔ خود امام ابو حنیفہ ان کے علمی لیاقت اور فقاہت کے قائل تھے، طلحہ بن جعفر کے مطابق وہ اپنے دور کے سب سے بڑے فقیہ تھے اور علم، قوت فیصلہ اور ریاست وقدرت میں بڑی دسترس رکھتے تھے۔ حسین بن ولید کی رائے یہ ہے کہ جب گفتگو کرتے تو سننے والا مرعوب ہوجاتا تھا کیونکہ ان کی باتوں میں حد درجہ کی گہرائی و گیرائی ہوتی تھی۔ مفتیوں کی تعلیم وتربیت میں ان کو خاص ملکہ تھا۔ بغداد میں وفات پائی۔ ان کی وفات سے خلیفہ ہارون الرشید بہت افسردہ تو امام کرخی جیسے جید عالم بھی رنجیدہ تھے۔ ہارون الرشید نے آبائی قبرستان میں تدفین کرائی اور تمام مسلمانوں کو ان کی وفات پر ایک دوسرے سے تعزیت کا حکم دیا۔(۸)

کتاب الخراج لکھنے کا سبب: یہ کتاب دراصل ایک طویل یادداشت ہے جو قاضی القضاۃ ابو یوسف نے خلیفہ ہارون الرشید (۱۷۰-۱۹۳ھ/ ۷۸۶-۸۰۹ء) کی فرمائش پر مرتب کی تھی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے تخت خلافت پر متمکن ہونے کے بعد رعایا کے ساتھ حسن سلوک اور عدل و مساوات کو اپناتے ہوئے حکمرانی کا ارادہ کیا تو اس مناسبت سے قاضی صاحب سے مختلف انتظامی اور مالی امور سے متعلق سوالات کیے اور ان سے رہنمائی کی خواہش ظاہر کی۔

> ''قاضی ابو یوسف نے موضوع کی نزاکت اور خلافت کے لیے اس کی اہمیت کو مدنظر رکھنے کے ساتھ ان سوالات کا جواب دیا اور خلیفہ ہارون الرشید کے لیے ایک جامع اور مفصل کتاب مرتب کردی۔ بعض اہم مسائل پر کسی نتیجہ تک پہنچنے سے پہلے انہوں نے اہل علم کی مجلس منعقد کرکے اس پر مذاکرہ کیا اور بعض مسائل پر خط وکتابت کے ذریعہ اہل علم سے معلومات حاصل کیں۔ اس کا اندازہ اس عبارت کے ابتدائی جملوں سے ہوتا ہے کہ ''ابو یوسف نے فرمایا'' یا ''ابو یوسف نے کہا''،

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب املا کرائی گئی تھی اور شاگردوں نے یہ الفاظ اپنی طرف سے بڑھا دیئے تھے۔ بعد میں جب یہ کتاب روایت کے ذریعہ نقل کی جانے لگی تو یہ جملے بھی کتاب کا جزء بن گئے"۔(۹)

کتاب الخراج کے اردو مترجم پروفیسر نجات اللہ صدیقی اس کے زمانۂ تصنیف کے متعلق لکھتے ہیں:

"امام ابو یوسف ۱۷۱ھ میں منصب قضاء پر فائز ہوئے اور ۱۸۲ھ میں وفات پائی۔ لہٰذا اس سے یہ قیاس لگایا جا سکتا ہے کہ کتاب الخراج اسی دور میں مرتب کی گئی، غالب گمان یہ ہے کہ یہ اہم ترین کام اس زمانہ کے ابتدائی دور ہی میں انجام دیا گیا ہو"۔(۱۰)

کتاب الخراج کے نسخے: پروفیسر نجات اللہ صدیقی نے اردو ترجمہ کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے کہ کتاب الخراج کے تین مطبوعہ نسخے پائے جاتے ہیں۔ پہلا ایڈیشن مطبعہ بولاق مصر سے (۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء) میں شائع ہوا تھا، جس کے لیے یہ وضاحت نہیں ہے کہ یہ ایڈیشن کس قلمی نسخے کے مطابق ہے۔ اس کے بعد طبع بولاق کی بعض غلطیوں کی تصحیح اور خزانۂ تیموریہ دارالکتب المصریہ، قاہرہ کے قلمی نسخے نمبر ۲۷۴ سے مقابلہ اور بعض اضافوں کے ساتھ مطبع سلفیہ، قاہرہ سے (۱۳۲۴ھ) میں شائع ہوا۔ اس مطبع سے (۱۳۵۲ھ) میں دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا تھا۔ نجات اللہ صدیقی نے بروکلمان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کتاب الخراج کے متعدد نسخے برٹش میوزیم، لندن، انڈیا آفس لائبریری، لندن قومی کتب خانہ، پیرس کتب خانہ سلیمانیہ، استنبول کتب خانہ، اسٹیٹ لائبریری رامپور، پشاور اور برلن کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ کتاب الخراج کے فرانسیسی مترجم نے کتب خانہ پیرس میں موجود چار مختلف نسخوں کا تذکرہ کیا ہے۔(۱۱)

کتاب الخراج کے مختلف زبانوں میں تراجم: فرانسیسی ترجمہ پروفیسر نجات اللہ صدیقی نے کیا تھا جو پیرس سے شائع ہوا ہے۔ اسی طرح ایک ترجمہ اطالوی زبان میں بھی ہوا ہے اس کے مترجم کا نام Ptrpol ہے۔ یہ ترجمہ ۱۹۰۶ء میں روما سے شائع ہوا تھا۔ لیکن یہ صرف ۳۳ صفحات پر مشتمل ہے یعنی یہ کتاب کے بعض مقامات کا ترجمہ یا کتاب کی تلخیص ہے۔ نجات اللہ صدیقی نے لکھا ہے کہ ایک روسی مستشرق نے بھی اس کا ترجمہ کیا ہے جو (۱۹۴۵ء) میں شائع ہوا۔ ترکی ترجمہ

(۱۹۰۳ء) میں شائع ہوا۔ جرمن میں کتاب الخراج سے متعلق چار صفحات کا ایک مضمون جریدہ جرمن مئی (۱۹۰۷ء) میں شائع ہوا ہے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) کی مطبوعہ فہرستوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا ایک اردو ترجمہ مولانا ابوالخیر مودودی نے کیا تھا، مگر سقوط حیدرآباد کے بعد یہ ادارہ بند ہوگیا۔ اب اس کے طبع و اشاعت کا امکان نظر نہیں آتا۔ دوسرا اردو ترجمہ پروفیسر نجات اللہ صدیقی کا ہے۔ یہ مکتبہ سلفیہ قاہرہ کے (۱۳۴۵ھ) کے ایڈیشن سے کیا گیا ہے۔ (۱۲)

خراج کے موضوع پر تصانیف: خلیفہ مہدی، مدت حکومت (۱۵۸۔۱۶۸ھ/ ۷۷۵ ۔۷۸۵ء) اور ہارون رشید (۱۹۳۔۱۷۰ھ/ ۸۰۹۔۷۸۶ء) کے دور میں خصوصاً اور دیگر عباسی خلفا کے دور میں عموماً مختلف علما نے خراج کے موضوع پر کتابیں تصنیف کی ہیں، چنانچہ حاجی خلیفہ مصطفیٰ بن عبداللہ (م ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء) نے کشف الظنون میں خراج کے موضوع پر پانچ (۱۳) اور محمد بن اسحاق الندیم (م ۳۸۴ھ/ ۱۰۴۷ء) نے الفہرست میں پندرہ کتابوں کے نام تحریر کیے ہیں۔ (۱۴)

جن علما کے نام کے ساتھ کتاب الخراج کا ذکر آتا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ ابوعبداللہ معاویہ بن عبداللہ (م ۱۷۰ھ/ ۷۸۶ء) کتاب الخراج۔ ۲۔ ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم (م ۱۸۲ھ/ ۷۸۹ء) کتاب الخراج۔ ۳۔ ابوعلی بن زیاد الولوی (م ۲۰۴ھ/ ۸۱۹ء) کتاب الخراج۔ ۴۔ ابوزکریا یحییٰ بن آدم القرشی (م ۲۰۳ھ/ ۸۱۸ء) کتاب الخراج۔ ۵۔ ابوعبدالرحمٰن بن عدی الثعلبی (م ۲۰۷ھ/ ۸۲۲ء) کتاب الخراج۔ ۶۔ احمد بن محمد بن عبدالکریم ابن ابی سہل (م ۲۰۷ھ ۸۲۲ء) کتاب الخراج۔ ۷۔ عبدالملک بن قریب الاسمعی (م ۲۱۳ھ/ ۸۲۸ء) کتاب الخراج۔ ۸۔ ابومحمد جعفر بن مشیر الثقفی (م ۲۳۴ھ/ ۸۴۸ء) کتاب الخراج۔ ۹۔ ابوعثمان عمر بن بحر الجاحظ (م ۲۵۵ھ ۸۶۹ء) رسالہ ابی النجم بالخراج۔ ۱۰۔ احمد بن عمر مہیر الشیبانی الحصاف (م ۲۶۱ھ/ ۸۷۵ء) کتاب الخراج۔ ۱۱۔ ابوسلیمان داؤد بن علی ظاہری (م ۲۷۰ھ/ ۸۸۴ء) کتاب الخراج۔ ۱۲۔ احمد بن سلیمان بن بشار الکاتب (م ۲۷۰ھ/ ۸۸۴ء) کتاب الخراج الکبیر۔ ۱۳۔ ابوالقاسم عبیداللہ بن احمد بن محمد اللواذانی (م ۳۶۳ھ/ ۹۴۷ء) کتاب الخراج۔ ۱۴۔ قدامہ بن جعفر بن قدامہ (م ۳۳۷ھ/ ۹۴۸ء) کتاب الخراج و صنعة الکتابة۔ ۱۵۔ ابوالحسن علی بن الحسن الملقب بابن الماشط، کتاب الخراج۔ ۱۶۔ اسحاق بن شریح الکاتب النصرانی، کتاب الخراج۔ ۱۷۔ عبدالرحمٰن بن عیسیٰ بن داؤد الجراح، کتاب الکبیر فی الخراج۔

۱۸۔ ابوالحسن علی بن وصیف، کتاب الایضاح والتشقیف فی آئین الخراج و رسومه ۔
۱۹۔ اسحاق بن یحییٰ بن سریح، کتاب الخراج الکبیر اور کتاب صناعة الخراج الصغیر۔
۲۰۔ ابونصر بن مسعود العیاشی، کتاب الجزیہ والخراج۔ ۲۱۔ علی بن احمد بن بسطام، کتاب الخراج۔
۲۲۔ محمد بن احمد بن علی بن خیار الکاتب، کتاب الخراج۔ ۲۳۔ نصر بن موسیٰ الرازی، کتاب الخراج۔
۲۴۔ زین الدین عبدالرحمٰن بن احمد بن رجب الحنفی (م ۷۹۰ھ/۱۳۹۳ء) الاستخراج احکام الخراج۔ ۲۵۔ ابوالقاسم عبداللہ بن العروم، کتاب الخراج۔ ۲۶۔ کتاب الخراج والمقاسمة۔
۲۷۔ السراج الوهاج فی حرمت الخراج۔ ۲۸۔ حل الجزیه۔

عبدالجبار الرفاعی نے فہرست الاقتصاد الاسلامی باللغة العربیه میں احمد الاردبیلی کی کتاب الرسالة الخراجیه اور عبداللہ آفندی کی کتاب الخراجیه کا ذکر کیا ہے۔ الاردبیلی اور آفندی کے مخطوطے قم ایران کے مکتبہ آئی ؟ اللہ المشرعی میں موجود ہیں۔(۱۵) محمد ضیاء الدین الریس کی الخراج والنظم المالیه للدولة الاسلامیه بھی اسی موضوع پر ہے۔

خراج کا مفہوم: پروفیسر نجات اللہ صدیقی نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

> ''لفظ خراج کو آرامی زبان کے لفظ Choregia سے مشتق بتایا گیا ہے جو محصول کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے مگر ڈاکٹر اے ابن شمس نے اس کی اصل آرامی زبان کے لفظ (HALAK) بتائی ہے جو محصول کے معنی کے لیے جانا جاتا ہے۔ فقہائے اسلام نے بھی اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے جس کے تحت فئے اور غنیمت کی آمدنی، محاصل چنگی، زمین کے محاصل اور جزیہ وغیرہ شامل ہیں''۔(۱۶)

البتہ کلام عرب میں خراج کے معنی کرایہ، محصول اور اجرت ومعاوضہ کے ہیں، جیسا کہ قرآن میں سورۂ مومنون آیت نمبر: ۷۲ میں خراج کا اطلاق اجرت کے معنی میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ مفسرین نے لکھا ہے ''ای اجرا علی ما جئتم به''۔

اصطلاح شرع میں اسے اسلامی ٹیکس کہا جاتا ہے یعنی وہ معاوضہ یا اجرت جو اسلامی حکومت اپنے مفتوحہ ممالک یا پھران زمینوں کے مالکوں سے وصول کرتی ہے جس نے صلح کرلی ہو، جیسا کہ معجم لغة الفقہا کے مصنف محمد رواس قلعہ جی نے بیان کیا ہے ''ما تاخذه الدولة من الضرائب علی الارض المفتوحة عنوة اوالارض التی صالح اهلها علیها''(۱۷) اس کے علاوہ

فقہائے اسلام نے اس لفظ کو اجرت اور معاوضہ کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔اوجزالمسالک کے مصنف مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے لکھا ہے: ''اما الثانی و ھو ما فتح عنوۃ فھی ما اجلی عنھا بالسیف ولم نقسم بین الغانمین و ھذہ تصیر وقفا للمسلمین یضرب علیھا خراج معلوم یوخذ منھا فی کل عام یکون اجرۃ لھا و تقر فی ایدی ار بابھا ما داموا یودون خراجھا''۔(۱۸) ''اور زمینوں کی دوسری قسم وہ ہے جو بذریعہ تلوار قوت سے فتح کی گئی ہو اور غنیمت حاصل کرنے والوں کے مابین تقسیم نہ کی گئی ہو تو وہ (آراضی) مسلمانوں کے لیے وقف ہوگی۔اس پر متعین کردہ خراج لگایا جائے گا جو اس کی اجرت کے طور پر ہر سال لیا جائے گا اور جب تک وہ ان زمینوں کا خراج ادا کیا جاتا رہے گا زمین مالکوں کے پاس رہے گی''۔

مذکورہ بالا تعریف کے مطابق خراجی زمینیں قانونی اعتبار سے اسلامی ریاست کی ملکیت ہوں گی، البتہ ان کو بدستور ان کے سابق مالکوں پر رہنے دیا جائے گا اور ان کی حیثیت موروثی کاشتکاروں کی ہوگی نیز ان کو بے دخل نہیں کیا جا سکتا ہے۔

کتب فقہ میں خراج اپنے خاص معنی کے اعتبار سے اس ٹیکس کو بولا جاتا ہے جس کو امام وقت کسی قابل کاشت خراجی زمین پر عائد کرتا ہے: ''للخراج فی اصطلاح الفقھاء معنیان عام و خاص فالخراج بالمعنی العام ھو الاموال التی تتولی الدولۃ امر جبایتھا او صرفھا فی مصارفھا واما الخراج بالمعنی الخاص فھو الوظیفۃ اوالضریبۃ التی یفرضھا الامام علی الارض الخراجیۃ النامیۃ''۔(۱۹)

عمومی معنی کے اعتبار سے خراج ان اموال کو کہتے ہیں جن کے جمع وصرف کی ذمہ داری حکومت کی ہو۔اس معنی کے اعتبار سے خراج کا اطلاق ان تمام صدقات واجبہ ونافلہ پر ہوگا جن کی وصولیابی اور ان کے مصارف پر خرچ کرنے کا حق حکومت کو ہو، قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج اور یحییٰ بن آدم القرشی کی کتاب الخراج میں یہ مفہوم واضح ہے۔(۲۰)

بہر حال زیادہ تر مصنّفین نے خراج کے عام معنی اور خاص معنی دونوں مراد لیے ہیں۔ اس ضمن میں فئے، خراج، جزیہ، عشور اور زکوٰۃ وغیرہ جیسے موضوعات بھی زیر بحث لائے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ بعض فقہا نے خراج کے خاص معنی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔قاضی ابو یوسف نے مفتوحہ آراضی کی تقسیم کے حوالہ سے عمر بن الخطاب کا موقف درج ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے: ''فقال

لهم فما يكون لمن جاء من المسلمين فترك الارض واهلها وضرب عليهم الجزية واخذ الخراج من الارض''۔(۲۱) ''پس انہوں (حضرت عمرؓ) نے (زمین کی: مجاہدین میں تقسیم (کے حامی صحابہ) سے یہ فرمایا کہ پھر آئندہ آنے والے مسلمانوں کے لیے کیا بچے گا؟ پس انہوں نے زمین اوراس کے باشندوں کو چھوڑ دیا اوران باشندوں پر جزیہ عائد کردیا اورزمین سے خراج لیا''۔

قاضی ابو یوسف کی کتاب میں مضامین کی وسعت ہے متذکرہ مسائل کے ساتھ ساتھ قوانین جنگ،فوجداری، دیوانی قوانین،حکمراں اورافسران حکومت کی ذمہ داریاں،رعایا کے فرائض، فلاح عامہ سے متعلق امور، ذمی، معاہد،مستامن، حربی، مرتد اور باغی افراد کے احکام، محکمۂ ڈاک،خبر رسانی، زمین، چراگاہوں، دریاؤں، چشموں، نہروں، شکار، بیع، جیسے اہم ترین احکام ومسائل پر مفصل ومدلل گفتگو کی گئی ہے۔(۲۲)

خراج کی تاریخی حیثیت: قبل از اسلام خراج کی دو مشہور اقسام رائج تھیں:

۱۔خراج وظیفہ یا مساحہ ۲۔خراج مقاسمہ۔

خراج وظیفہ یا مساحہ: یہ رقبہ کے ایک یونٹ پر ٹیکس لگانے کا طریقہ ہے یعنی زمین کا محصول رقبہ کے حساب سے ایک متعین شرح کے مطابق وصول کیا جاتا۔ اتنے درہم فی جریب اور اتنا غلہ فی جریب۔خراج کی مقدار کا انحصار زمین کی نوعیت، آب پاشی کے طریقہ، پیداوار کی نوعیت، بندرگاہوں اور بازاروں کی نزدیکی پر ہوتا تھا۔

خراج مقاسمہ کا طریقہ یہ تھا کہ ٹیکس زمین کے رقبہ کے حساب کی جگہ پیداوار کے مطابق بطور فصل کے ایک متعین حصہ طے کرلیا جاتا تھا، جیسے ۱/۳ یا ۱/۴ وغیرہ۔ بادشاہوں اور کاشت کاروں کے مابین مقاسمہ کا نظام عہد قدیم سے رائج تھا اور یہ طریقہ فارس کی حکومت میں چلا آرہا تھا۔اس کے بعد قباذ بن فیروز، شاہ ایران نے اپنے عہد حکومت میں اس نظام کو بدل کر مساحہ کا طریقہ رائج کیا۔ اس کے بیٹے کسریٰ نوشیرواں (۵۳۱ء۔۵۷۸ء) نے اپنے دور حکومت میں اسی طریقہ کو باقی رکھا۔ (۲۳) اسلام میں سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے عراق وشام کی مفتوحہ زمینوں پر خراج عائد کیا۔ (۲۴) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ ان علاقوں کو مسلمانوں کی فاتح فوج میں مال غنیمت کی طرح تقسیم کردیں لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ اگر میں ان زمینوں کو اس وقت تقسیم کردوں تو اس سے مسلمانوں کو آئندہ آنے والی نسلوں کی حق تلفی ہوگی اور تم

لوگ فارغ البال ہو جانے کی وجہ سے جہاد میں حصہ نہ لو گے،لیکن اگر میں یہ علاقہ ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دوں تو ہماری سرحد دشمنوں کے حملہ سے محفوظ رہے گی اور ہمیں سامان حرب اور رسد برابر وصول ہوتے رہیں گے۔اسی بنا پر انہوں نے ایسی زمین کو اس کے پرانے مالکوں کے قبضہ میں رہنے دیا اور خراج کا نظم کر دیا۔(۲۵) حضرت عمرؓ نے علاقہ سواد کی پیمائش کے لیے حضرت عثمان بن حنیف (م ۴۱ھ/ ۶۶۱ء) کو مقرر کیا، کیونکہ وہ زمینوں کی پیمائش کے سلسلہ میں خاصی مہارت رکھتے تھے(۲۶)اور ان کے ساتھ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ (م ۳۶ھ) کو معاون کی حیثیت سے روانہ کیا۔(۲۷)اس علاقہ کا طول ایک سو پچیس فرسنگ اور عرض اسّی فرسنگ تھا۔ کل رقبہ تین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب تھا، چنانچہ حضرت عثمان بن حنیف نے زمینوں کی پیمائش کر کے حسب ذیل شرحوں کے مطابق خراج عائد کیا:

انگور کے باغ پر فی جریب: دس درہم۔کھجور کے باغ پر فی جریب: آٹھ درہم۔بانس اور نرکل پر فی جریب: چھ درہم۔گندم کے کھیت پر فی جریب: چار درہم۔جو کے کھیت پر فی جریب: دو درہم۔(۲۸)

حضرت عمرؓ کے دور حکومت (۱۳ھ-۲۴ھ) میں عراق کی مال گزاری کا بندوبست اس طرح تھا کہ وہاں کی تمام آراضی کی پیمائش کر لی گئی تھی اور ہر جریب زمین چاہے وہ مزروعہ ہو یا غیر مزروعہ، اس میں عملاً کاشت ہوتی ہو یا نہ ہو، اس کو کنویں سے سینچا جاتا ہو یا نہر سے، ایک متعین لگان وصول کیا جاتا تھا۔(۲۹) حضرت عثمانؓ (۲۴ھ-۳۵ھ) اور حضرت علیؓ بن ابی طالب (۳۵ھ-۴۰ھ) کے زمانہ میں بھی یہ نظام اسی طرح چلتا رہا۔عہد اموی میں بھی خراج کے طریقہ میں تبدیلی نہ ہوئی۔عبدالملک بن مروان (۶۵ھ-۸۶ھ) نے یہ تبدیلی کی کہ تحصیل خراج کے حساب کتاب کے لیے علاقوں کی قدیم زبانوں کی بجائے عربی زبان کو استعمال کیا جائے۔(۳۰) دوسری تبدیلی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (۹۹ھ-۱۰۱ھ) کے زمانہ حکومت میں واقع ہوئی۔انہوں نے عبدالمجید بن عبدالرحمٰن کو ایک تحریر ارسال کی کہ غیر مزروعہ آراضی پر اتنا خراج نہ لگانا جو آباد زمین پر لگایا جاتا ہے اور نہ آباد زمین کی تشخیص خراج غیر مزروعہ زمین کے خراج کی مقدار سے کرنا، جو غیر مزرعہ زمین ہوا سے دیکھ کر اس کی حیثیت کے مطابق خراج عائد کرنا اور جو شخص اسلام قبول کر لے اس سے خراج نہ لیا جائے۔(۳۱) عباسی خلافت میں ابوالعباس عبداللہ بن محمد المعروف بہ سفاح (۱۳۲ھ-۱۳۶ھ) اور ابوجعفر منصور (۱۳۶ھ-۱۵۸ھ) کے دور حکومت میں خراج وظیفہ پر عمل ہوتا رہا۔ابوجعفر منصور نے خصوصی دلچسپی

لے کر اس نظام میں جو خامیاں تھیں انہیں دور کرنے کی سعی کی ۔ ابوعبداللہ محمد بن عبدوس الجہشیاری (م ۳۳۱ھ/۹۴۲ء) نے کتاب الوزراء والکتاب میں لکھا ہے کہ ابوجعفر منصور نے علاقۂ سواد کے لیے محاصل پر نظر ثانی کے لیے بھیجا۔(۳۲) اس کے دور میں مشہور ادیب عبداللہ بن المقفع (م ۱۴۲ھ) نے ایک یادداشت، رسالہ فی الصحابہ کی صورت میں خلیفہ کو ارسال کیا تھا اس میں دیگر انتظامی معاملات کے علاوہ خراج اور امور خراج کے بارے میں بھی رہنمائی کی گئی تھی ۔(۳۳)

انداز بیان: کتاب الخراج کا موضوع وہ معاملات ہیں جو حکومت اور رعایا کے مابین رونما ہوتے ہیں اور جن کا تعلق اس بات سے ہے کہ مملکت کے نظام میں حکومت کی پالیسی کس نوعیت کی ہونی چاہیے مثلاً بندوبست آراضی، نظام آب پاشی، نظام محصولات وغیرہ میں ۔

کتاب کے ایک طویل مقدمہ میں مصنف نے خلیفہ کو مؤثر انداز میں رعایا پروری کی ہدایت کی:

> ”کتاب میں مصنف نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تقریباً ۱۵۸/ارشادات صحابہؓ وتابعینؒ کے ۳۳۶/اقوال کا ذکر کیا ہے۔ ان میں بیشتر مختصر ہیں لیکن خاصی تعداد ایسی روایتوں کی بھی موجود ہے جو کئی کئی صفحات پر مشتمل ہیں۔ قاضی ابویوسف نے طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ پہلے دربار خلافت کے سوال کا جواب دیتے ہیں اور پھر اس جواب کی تائید میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ یا تابعین کے قول وفعل کو بطور سند پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے احکام اراضی اور ٹیکسوں کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تقریباً ۶۰ ارشادات نقل کیے ہیں۔ ان میں سے پچپن وہ ہیں جن کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے اور بقیہ پانچ وہ ہیں جن میں یہ الفاظ ملتے ہیں عن بعض اشیاخنا ۔(۳۴) جن احادیث کو روایت کیا گیا ہے ان کو اصحاب صحاح ستہ نے اپنی مؤلفات میں ذکر کیا ہے، صحابہ اور تابعین کے اقوال میں ان صحابہ کے اعمال کو سنداً پیش کیا ہے جن کے کارنامے زیادہ شہرت کے حامل ہیں، مثلاً حضرت عمر بن الخطابؓ (۱۳ھ-۲۴ھ)، حضرت ابوبکر صدیقؓ (۱۱ھ-۱۳ھ) اور حضرت علیؓ بن ابی طالب (۳۵ھ-۴۰ھ)، حضرت عثمان غنیؓ (۲۴ھ-۳۵ھ) کے عہد کے بعض نظائر بھی بیان کیے گئے ہیں جو نجران کے اہل ذمہ، جاگیروں اور بعض فوجداری قوانین سے متعلق ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اقوال وآرا سب سے زیادہ بیان کیے گئے ہیں۔(۳۵) محاصل کی تحصیل اور اس کے طریقہ میں شرعی اصلاحات کے نفاذ عشر، خراج، جزیہ کی شرحوں اور فلاح عامہ سے متعلق امور پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے نظائر وشواہد سے استنباط کیا گیا ہے، عبدالملک بن مروان کی صرف ایک مثال عراق میں جزیہ اور خراج کی شرحوں کے تذکرہ میں پیش کی گئی ہے۔(۳۶) اگر صحابہ، علما، تابعین میں صرف ان حضرات کے اقوال جو معتمد علیہ ہیں یا جو اقوال قرآن واحادیث کے بنیادی اصولوں سے متصادم نہیں ہیں، قاضی ابو یوسف کی اس فہرست میں کوفہ کے ہی نہیں حجاز اور شام کے شیوخ بھی شامل ہیں۔ وہ مختلف ائمہ کے فتاوی بیان کرتے ہیں جس سے ان کی بے تعصبی اور وسعت قلبی کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً اس ضمن میں سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر، ابراہیم نخعی، عامر بن شراحیل الشعبی وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

قاضی ابو یوسف بیشتر کوفہ کا فقہی نقطہ نظر پیش کرتے ہیں، تاہم انہیں علمائے حجاز وشام سے بھی بیر نہیں۔ کوفہ کے علما ہوں یا پھر حجاز وشام کے، قاضی صاحب دونوں کے اقوال کو یکساں انداز میں پیش کرتے ہیں۔(۳۷)

انہوں نے چودہ مقامات پر امام ابو حنیفہ کی رائیں نقل کی ہیں اور انہیں الفقیہ المقدم کہا ہے۔(۳۸) انہوں نے امام ابو حنیفہ کی رائے کے ساتھ دلائل بھی دیے ہیں اور قیاس واستحسان کی وجہ بھی بتائی ہے۔ اس کی واضح مثال احیائے اموات کے مسئلہ میں ہے۔(۳۹) بعض مقامات پر قیاس کو چھوڑ کر کسی مصلحت سے استحسان کو اختیار کیا ہے۔

حکمرانوں کی ذمہ داریاں: قاضی ابو یوسف نے خلیفہ کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے کہ:

> ”امیر المومنین خدائے بزرگ وبرتر نے جس کی ذات ہر طرح کی حمد و ستائش کی واحد مستحق ہے آپ پر بڑی بھاری ذمہ داری ڈال دی ہے جس کو حسن و خوبی انجام دیا جائے تو ثواب سب سے زیادہ ہوتا ہے اور (کوتاہی ہو تو) اس کی سزا بھی ساری سزاؤں سے زیادہ سخت ہے۔ اللہ نے امت کے معاملات کا بار آپ کے کاندھوں پر ڈالا ہے۔ آپ صبح وشام ہر آن خلق خدا کی ایک کثیر تعداد کے لیے (ایک عمارت کی) تعمیر میں مصروف ہیں۔ اللہ نے آپ کو ان کا نگراں اور جملہ امور کا سرپرست بنا دیا ہے۔ اس طرح سے وہ ان کے ذریعہ آپ کا امتحان

لے رہا ہے۔عمارت اگر تقوی کے سوا کسی اور چیز پر کھڑی کی گئی تو بعید نہیں کہ اللہ اس کو بنیادوں سے اکھاڑ کر اس کے معمار اور اس کے مددگاروں کے سر پر گرادے۔ خبردار! اللہ نے اس امت اور رعیت کے جو کام آپ کے سپرد کیے ہیں انہیں خراب نہ کریں کیوں کہ اللہ ہی قوت عمل عطا کرنے والا ہے‘‘۔(۴۰)

ایک اور جگہ لکھا کہ:

’’آپ نے جن باتوں کے قلم بند کرنے کا حکم دیا تھا ان کو میں نے تفصیل و تشریح کے ساتھ مرتب کردیا۔آپ ان کو اچھی طرح سمجھ لیں ان میں غور فکر کریں اور ان کو بار بار پڑھیں تاکہ آپ کے ذہن نشیں ہوجائیں۔

آپ کے لیے میں نے کافی جدو جہد کی ہے اور اس تحریر میں جو باتیں پیش کی گئی ہیں ان کے مطابق آپ نے عمل کیا تو مجھے توقع ہے کہ اللہ آپ کے خراج میں اضافہ کریگا،بغیر اس کے کہ کسی مسلمان اور معاہد پر ظلم کی نوبت آئے اور اللہ آپ کی رعایا کی حالت بھی بہتر کریگا۔رعایا کی ترقی دراصل اس میں ہے کہ حدود اللہ نافذ کی جائیں ان پر نہ تو حکومت کی طرف سے کوئی ظلم ہونے پائے اور نہ وہ حقوق کے مشتبہ ہونے کی وجہ سے باہم ظلم کریں‘‘۔(۴۱)

مزید لکھا کہ:

’’اے امیر المومنین! مواخذہ کا جواب تیار رکھیے۔آج آپ اپنے نامہ اعمال پر جو عمل بھی ثبت کریں گے وہی کل آپ کو سنایا جائے گا اور ذرا اس عالم کا تصور کیجیے جب بھرے مجمع میں اس تعلق کو بے نقاب کردیا جائے گا جو آپ نے اللہ سے کر رکھا ہے۔امیر المومنین میں آپ کو تہ دل سے نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ نے جن چیزوں کی حفاظت و پاسداری آپ کے ذمہ کی ہے ان کا پورا تحفظ کیجیے اور جن امور کی نگرانی آپ کے سپرد کی ہے ان کی پوری پوری دیکھ بھال کیجیے۔اس معاملہ میں صرف اللہ کی طرف دیکھیے،جو کچھ کیجیے صرف اسی کے لیے کیجیے،کسی دوسرے کی طرف نظر نہ اٹھائیے۔بات یہ ہے کہ اگر آپ اس طرز عمل کو نہیں اپنائیں گے تو ہدایت کی آسان راہ آپ کے لیے مشکل ہوجائے گی اور اس کی وسعتیں آپ کے لیے تنگی سے بدل جائیں گی‘‘۔(۴۲)

حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا کہ:

''لوگو! خبردار، ہم تم پر یہ حق رکھتے ہیں کہ ہمارے پیٹھ پیچھے بھی ہمارے خیر خواہ رہو اور بھلائی کے کاموں میں ہم سے تعاون کرتے رہو اے لوگو کی نگرانی کا فرض انجام دینے والو! آگاہ رہو کہ امام کی بردباری اور نرم روی سے زیادہ نہ تو اللہ کو کوئی بردباری اور نرم روی پسند ہے اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی اور چیز ہمہ گیر نفع کی حامل ہے اور امام کی تند مزاجی سے زیادہ نہ تو اللہ کو بدخلقی مبغوض ہے اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی اور چیز ہمہ گیر نقصان کی حامل ہے، جو اپنے ماحول میں امن و عافیت اختیار کرتا ہے اسے اوپر سے بھی امن و عافیت عطا ہوتی رہتی ہے'' (۴۳ و ۴۴)

ایک اور قول عمرؓ یہ ہے کہ:

''اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ سعادت مند نگراں وہ ہے جس کے سبب اس کی رعایا کو سعادت نصیب ہو اور سب سے بدبخت وہ جس کی وجہ سے اس کی رعایا تباہ ہو جائے''۔

حضرت علیؓ کا یہ بیان بھی نقل کیا کہ:

''دیکھو ان کے ذمہ جو کچھ خراج نکلتا ہو سب کا سب پورا وصول کرنا۔ خبردار! اس سلسلہ میں ان کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرنا اور ایسا نہ ہو کہ تمہارے اندر ذرا بھی کمزوری محسوس کریں، آگے راوی کہتا ہے کہ پھر آپ نے مجھ سے فرمایا کہ ظہر کے وقت میرے پاس آ جانا چنانچہ میں ظہر کے وقت گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا میں نے تمہاری عملداری کے باشندوں کے سامنے تم کو جو نصیحت کی تھی وہ اس لیے تھی کہ یہ بڑے چال باز لوگ ہیں دیکھو جب وہاں جانا تو خراج وصول کرنے کے سلسلہ میں ان کا کوئی جاڑے یا گرمی کا کپڑا نہ فروخت کرنا، نہ غذائی اشیا جو ان کے زیر استعمال ہوں، نہ وہ جانور جن کے سہارے وہ محنت مزدوری کرتے ہوں اور نہ ایک درہم کی خاطر کسی کو کوڑا مارنا، نہ کسی کو ایک پاؤں پر کھڑا کرنا اور نہ خراج وصول کرنے کے لیے کسی کا سامان نیلام کرنا، کیونکہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم صرف ان کی ضروریات سے زائد مال وصول کریں۔ اگر تم نے میرے ان احکام

کی خلاف ورزی کی تو مجھ سے پہلے اللہ تمہارا مواخذہ کرے گا۔ ہاں کسی کی خلاف ورزی کی اطلاع مجھے ملی تو تم کو معزول کر دونگا''۔(۴۵)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے انتقال کے بعد جب ان کی اہلیہ محترمہ سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا۔

''خدا کی قسم روزے نماز کے اعتبار سے تو وہ تم سب سے آگے نہ تھے لیکن میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے خوف خدا میں کسی انسان کو عمر سے آگے نہیں پایا اللہ رب العزت آپ پر رحمت نازل کرے آپ نے اپنے جسم و جان کو عام انسانوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ دن بھر ان کی ضروریات کے سلسلہ میں بیٹھے رہتے تھے۔ شام ہوتی اور ابھی کچھ ضروریات باقی رہتی تو رات میں بھی مسلسل کام کرتے چلے جاتے ایک دن شام کو لوگوں کی ضروریات سے فارغ ہو چکے تو چراغ طلب کیا جسے آپ ذاتی خرچ سے جلایا کرتے تھے اور دو رکعت نماز ادا کی، پھر اپنی ٹھوڑی ہتھیلی پر ٹیک کر بیٹھ گئے رخساروں پر آنسو جاری تھے سپیدۂ سحر نمودار ہونے تک اسی حال میں رہے اور پھر صبح ہوئی تو روزے سے تھے۔ اس پر میں نے عرض کیا آج رات کوئی خاص بات تھی جو میں یہ حال دیکھ رہی ہوں؟ آپ نے فرمایا ہاں میں نے خود کو اس پوری امت کے سیاہ وسفید کا ذمہ دار پایا۔ مجھے زمین کے مختلف گوشوں میں پھیلے ہوئے غریب الوطن، خستہ حال، بھکاری، محتاج، غربا، مجبور و مظلوم قیدی اور اسی قبیل کے دوسرے لوگ یاد آئے مجھے یہ احساس ہوا کہ اللہ ان سب کے بارے میں مجھ سے محاسبہ کریگا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معاملہ میں میرے خلاف مقدمہ لڑیں گے، مجھے خوف ہے کہ اللہ کے آگے میرا کوئی عذر نہ چلے گا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو میں کسی دلیل سے بھی قائل نہیں کر سکوں گا اس پر میری جان لرز اٹھی، مجھے اپنے بارے میں بڑا ڈر لگنے لگا''۔(۴۶)

ناداروں کی ضروریات کی تکمیل: قاضی ابو یوسف نے مذکورہ مباحث کے بعد مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ قرآن کریم اور ان احادیث و آثار کو ذکر کیا ہے جن میں مال غنیمت کے بارے میں ہدایات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مال غنیمت میں سے خمس کے

مصارف پر روشنی ڈالتے ہوئے ان چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے جو مال غنیمت سے تعلق تو نہیں رکھتی البتہ ان پر خمس نافذ ہوتا ہے جیسے کان، معادن وغیرہ۔

خمس کے باب میں لکھا کہ:

> ''غنیمت میں سے جو خمس نکال لیا جاتا ہے اس کے پانچ حصہ کیے جاتے ہیں۔ اللہ اور رسول کے لیے ایک حصہ، قرابت داروں کے لیے ایک حصہ اور تین حصے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے، اس کے بعد ابوبکرؓ، عمرؓ خمس کو تین حصوں میں تقسیم کرنے لگے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ اور قرابت داروں کا حصہ ساقط ہو گیا اور وہ باقی تین حصوں پر تقسیم کیا جانے لگا، پھر علیؓ بن ابی طالب نے بھی اسی طرح تقسیم کیا جس طرح سابقہ تینوں خلفاء نے تقسیم کیا تھا''۔ (۴۷)

جابر بن عبداللہ کی یہ روایت بیان کی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم خمس میں سے راہ خدا میں خرچ فرماتے تھے اگر مال زیادہ ہو جاتا تھا تو اسے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو بھی دیتے۔ (۴۸) یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ قاضی ابو یوسف نے دفینہ کے متعلق مسئلہ یہ بیان کیا ہے کہ ''اگر مسلمان دارالحرب میں بغیر امان لیے داخل ہوا ہو اور وہاں اسے کوئی دفینہ ہاتھ لگے تو وہ پورا کا پورا اسی کا ہوگا، اس میں سے خمس نہیں وصول کیا جائے گا۔ اس نے یہ دفینہ جس زمین سے پایا ہو خواہ وہ کسی حربی شخص کی مملوکہ تھی یا غیر مملوکہ تھی، کسی صورت میں بھی اس پر خمس عائد نہیں ہوگا۔ کیونکہ مسلمانوں نے اس کی خاطر فوج کشی نہیں کی تھی لیکن اگر یہ شخص امان لے کر داخل ہوا اور کسی آدمی کی مملوکہ زمین میں اسے دفینہ مل جائے تو وہ دفینہ مالک زمین کا حق ہوگا، البتہ دفینہ کسی ایسی زمین میں پایا گیا ہو جو کسی آدمی کی ملک میں نہ ہو تو وہ پانے والے کا حق ہوگا''۔ (۴۹)

خلیفہ نے قاضی ابو یوسف سے درج ذیل مسائل کے متعلق معلومات دریافت کیے:

۱۔ ارض سواد (اس سے عراقی زمینیں مراد ہیں جو گھنے اور سیاہی مائل سبزے کی وجہ سے ارض سواد کے نام سے مشہور تھیں) کا کیا معاملہ تھا۔

۲۔ ان علاقوں کے باشندوں کے ساتھ خراج اور جزیہ کے حوالہ سے کیا برتاؤ کیا گیا؟

۳۔ حضرت عمرؓ نے ان پر کیا شرحیں عائد کی تھیں؟

۴۔ کیا سواد کے بعض علاقہ صلح کے تحت آتے ہیں؟

۵۔ صلح کے ذریعہ حاصل ہونے والے اور مفتوحہ علاقوں کے کیا احکام ہوں گے؟

ان کے علاوہ بھی کئی سوالات تھے۔

قاضی ابو یوسف نے امیر المومنین کو مشورہ دیا کہ ''اگر آپ اللہ کا قرب حاصل کرنے کی خاطر ہر مہینہ یا مہینہ میں دوبار ایک اجلاس خاص اس لیے کریں کہ رعایا کی فریاد سنیں اور ظالموں کو متنبہ کریں تو مجھے امید ہے کہ آپ کا شماران حکمرانوں میں نہ ہوگا جو اپنی رعایا کی ضرورت سے بے نیاز رہتے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ اس طرح کے دو ایک اجلاس ہوتے ہی یہ خبر اطراف و جوانب میں عام ہو جائے گی۔ ہر ظالم کو اس بات کا ڈر ہوگا کہ اس کی خبر آپ تک پہنچ جائے گی اور اس طرح وہ ظلم سے باز آجائے گا۔ ادھر کمزور لوگوں کو یہ سہارا ہو جائے گا کہ آپ ان کے معاملہ پر غور فرمائیں گے''۔(۵۰)

''عمال و محصلین کو ہدایت کرنی چاہیے کہ وہ خراج وصول کرتے وقت کسی طرح کی ناانصافی کا ارتکاب نہ کریں۔ جن افراد کے لیے آپ مامور کریں انہیں پہلے ہی دن ہدایت کر دیں کہ اپنی عملداری کے باشندوں پر ظلم و زیادتی سے پرہیز کریں۔ ان کی تحقیر و توہین نہیں کرنی چاہیے، بلکہ تھوڑا سختی اور معمولی گرفت کے ساتھ خوش اخلاقی سے کام لینا چاہیے۔ رعایا پر ظلم کرنے یا بیجا بار ڈالنے سے گریز کیا جائے۔ مسلمانوں کے ساتھ نرمی، بدکرداروں کے ساتھ سختی اور غیر مسلم اہل ذمہ سے عادلانہ برتاؤ کیا جائے۔ اسی طرح مظلوم کی دادخواہی، ظالموں پر سختی اور عام لوگوں کے ساتھ عفو و درگزر کی پالیسی اپنائی جائے اس رویہ کے اپنانے سے لوگوں کے قلوب میں جگہ پیدا ہوگی۔ خراج کی تحصیل اسی ضابطہ کے ساتھ عمل میں لائی جائے۔ محصلین خراج اپنی طرف سے نئے طریقہ وضع کرنے کے ساتھ کوئی دوسرا سلوک نہ کریں۔ والی کو چاہیے کہ اپنی مجلس میں تمام لوگوں کے ساتھ مساوی سلوک کرے تاکہ نزدیک اور دور کے لوگ معزز، پست حیثیت افراد، سب حق کے مقابلہ میں برابر ہوں۔ والی کو خواہشات کی پیروی کرنے سے بچتے رہنا چاہیے، کیونکہ جو لوگ اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور اطاعت و فرمانبرداری کو دوسروں کی اطاعت و فرمانبرداری پر ترجیح دیتے ہیں انہیں اللہ نے ممتاز قرار دیا ہے''۔(۵۱)

قاضی ابو یوسف نے یہ بھی لکھا ہے کہ خراج کی رقم وصول کرنے کی خاطر کسی آدمی کو مارنا یا ایک ٹانگ پر کھڑا کرنا بھی سراسر ظلم ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ افسران خراج لوگوں کو دھوپ میں کھڑا رکھتے ہیں انہیں زدوکوب کرتے ہیں ان کی گردنوں میں گھڑے لٹکاتے ہیں اور انہیں اس

طرح پابہ زنجیر کردیتے ہیں کہ وہ نماز بھی ادا نہیں کرسکتے ہیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی نظر میں بہت ہی بری ہے اور اسلام میں ایسی سزائیں ناپسندیدہ ہیں۔(۵۲) قاضی ابویوسف عدل کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عدل وانصاف کرنے اور ظلم وجور سے پرہیز کرنے میں جو اخروی اجر ہے اس کے ماسوا ان علاقوں کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے اور خراج کی آمدنی بڑھتی ہے۔ برکت عدل سے وابستہ ہے۔ ظلم وجور سے برکت ختم ہوجاتی ہے۔ جو خراج ظلم وجور کے ذریعہ وصول کیا جاتا ہے اس سے ملک میں بدحالی اور تباہی آتی ہے۔

حضرت عمر بن الخطابؓ کا عہد ملاحظہ ہو کہ باوجود اس کے کہ آپ اہل خراج کے ساتھ کامل عدل وانصاف کا معاملہ کرتے اور ان پر سے ہر طرح کے ظلم کا ازالہ کرتے رہتے تھے۔ ان کے زمانہ میں سواد سے دس کروڑ درہم کی آمدنی ہوتی تھی، جب کہ اس زمانہ میں درہم کا وزن ایک مثقال ہوتا تھا۔(۳۵) رعایا کے ساتھ حسن سلوک کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کی جملہ ضروریات کی تکمیل کا سامان حکومت مہیا کرے۔ معاشرہ کی خوشحالی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ ہر طرح سے اچھائی کا رویہ اپنایا جائے۔ چنانچہ اسی وجہ سے قاضی ابویوسف نے امیر المومنین کو مشورہ دیا کہ:

> ''آپ خراج کے افسران کو ہدایت کردیں کہ جب ان کی عملداری کے کچھ لوگ ان کے پاس آکر یہ بتائیں کہ ان کے علاقوں میں بعض قدیمی نہریں ہیں جواب ناکارہ ہوگئی ہیں اور بہت سی زمینیں ناکارہ ہوکر بغیر کاشت کے پڑی ہوئی ہیں اور یہ کہ ان نہروں کی کھدائی اور صفائی ہوجائے اور ان میں ازسرنو پانی جاری ہوجائے تو یہ ناکارہ زمین پھر کاشت کے قابل ہوجائے گی اور اس طرح خراج کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ اس سلسلہ کی تمام معلومات فراہم کرنے کے بعد آپ نے ان نہروں کی کھدائی اور صفائی کا حکم جاری کیا اور اس سے وابستہ مصارف کا بار بیت المال اٹھائے گا۔ ان اخراجات کا بار اس علاقے کے باشندوں پر نہ ڈالیے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کا آباد و خوشحال رہنا ان کے اجڑ جانے اور مفلس ہوکر ادائیگی خراج سے عاجز رہ جانے سے بہتر ہے''۔(۵۴)

مذکورہ سطور کی روشنی میں یہ کہنا درست ہے کہ قاضی ابویوسف نے انسانی اقدار اور اس کی فضیلت و برتری برقرار رکھنے کے لیے کتاب الخراج کی صورت میں ایک جامع دستاویز مرتب کی

ہے، جبکہ حاکم وقت رعایا کا ہر طرح سے خیال رکھے گا اور خلق خدا کے ساتھ عدل ومساوات کو قائم کرے گا تو یقیناً معاشرہ کا ہر فرد سکون واطمینان سے زندگی بسر کرے گا کیونکہ امن کی ضرورت ہر زمانہ میں ہر سماج کو رہی ہے اور رہے گی۔

غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا حکم: جزیہ اسلامی ریاست ان لوگوں سے وصول کرتی ہے جو اسلامی حکومت کے تحت رہتے ہیں دراصل یہ ان کی حفاظت کے عوض میں لیا جاتا ہے۔قاضی ابو یوسف نے اہل ذمہ سے متعلق الگ فصل قائم کرکے بحث کی ہے۔چنانچہ جزیہ سے مستثنیٰ افراد کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ’’ایسے مسکین جن کو خیرات دی جاتی ہو، اندھے جن کا نہ کوئی پیشہ ہو نہ وہ کوئی کام کرنے کے لائق ہوں، وہ شخص جو خیرات کا مستحق ہو اور نہ کسی معذور آدمی سے جزیہ لیا جائے گا۔یہی حال ان راہبوں کا ہے جو خانقاہوں میں رہتے ہیں، اگر یہ خوشحال ہوں تو ان سے جزیہ لیا جائے گا اور اگر مسکین ہوں اور ان کے خوشحال ہم مذہب خیرات دیتے ہوں تو جزیہ نہیں لیا جائے گا۔
>
> صومعے والے اگر مالدار ہوں تو ان کے ساتھ بھی یہی برتاؤ ہوگا، اگر انہوں نے اپنا سارا مال خانقاہوں اور ان میں رہنے والے راہبوں اور کارکنوں کے مصارف کے لیے وقف کردیا ہو تو ان سے جزیہ لیا جائے گا اور مطلوبہ رقم مہتمم خانقاہ سے وصول کی جائے گی۔اگر خانقاہ کا مہتمم جس کے ہاتھ میں یہ چیزیں ہوں یہ کہے کہ اسے یہ مال نہیں ملا ہے اور اس پر خدا کو گواہ بنا کر قسم کھائے اور اس کے ہم مذہب جس طرح حلف اٹھاتے ہوں اس طرح حلف اٹھائیں تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔(۵۵) اسی طرح قاضی ابو یوسف نے آگے لکھا ہے کہ، ایسے بوڑھے آدمی جو کام کرنے سے معذور ہوں اور تنگدست ہوں، نیز فاتر العقل سے بھی جزیہ نہیں لیا جائے گا‘‘۔(۵۶)

قاضی ابو یوسف نے امیر المومنین سے کہا کہ جن لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ حاصل ہے ان کے ساتھ نرمی برتنا اور ان کے احوال کا جائزہ لیتے رہنے میں ذرا بھی کوتاہی نہ برتیے تاکہ ان لوگوں پر ظلم وزیادتی کا سدباب ہو ان پر ان کی برداشت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے اور ان کے مال میں سے اتنا ہی لیا جائے جو حق کی رو سے ان پر واجب ہے۔(۵۷) اس کے بعد قاضی ابو یوسف نے ان روایات کا تذکرہ کیا ہے جو ذمیوں کے ساتھ زیادتی کرنے کی ممانعت میں آئی ہیں، مثلاً

شام کے علاقے میں کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے گزر ہوا جن کو دھوپ میں کھڑا کر رکھا تھا جب دریافت کیا تو بتایا کہ یہ لوگ جزیہ ادا نہ کرنے کی بنا پر دھوپ میں کھڑے کیے گئے ہیں۔راوی کہتا ہے یہ بات ان کو بری معلوم ہوئی اورانہوں نے ان کے امیر کے پاس جا کر کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جوانسانوں کو............؟ ؟ اسے اللہ عذاب دے گا۔(۵۸)

غیر مسلموں کی کفالت: قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے "عمر بن الخطابؓ کا گزر کسی کے دروازے کے سامنے سے ہوا جہاں ایک سائل بھیک مانگ رہا تھا۔یہ ایک بوڑھا آدمی تھا جس کی بصارت زائل ہوچکی تھی۔آپ نے اچھے سے اس کے بدن کوٹھونکا اور پوچھا کہ کس مذہب کے اہل کتاب ہو اس نے جواب دیا کہ میں یہودی ہوں۔آپ نے پوچھا کس چیز نے ایسا کرنے پر مجبور کیا؟ اس نے جواب دیا میں بڑھاپے کی حاجت مندی اور جزیہ کے باعث بھیک مانگ رہا ہوں۔راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ اس کو ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور گھر میں سے لاکر اسے کچھ دیا، پھر آپ نے بیت المال کے خازن کو بلوایا اور ان سے کہا: اس کا اور اس جیسے افراد کا خیال رکھو، کیونکہ یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ان کی جوانی میں ہم ان سے جزیہ (وصول کرکے) کھائیں اور بڑھاپا آئے تو انہیں بے سہارا چھوڑ دیں۔ اس کے بعد آپ نے اس آدمی اور اس جیسے دوسرے افراد سے جزیہ بھی ساقط کر دیا"۔(۵۹)

اسی طرح قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے کہ:

> "امیر المومنین عمر بن عبدالعزیزؒ سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ آپ کے زمانہ میں نرخ گراں ہے اور آپ سے پہلے کے حکمرانوں کے دور میں ارزاں تھا؟ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے جو لوگ حکمراں تھے وہ ذمیوں پر ان کی برداشت سے زیادہ بار ڈال دیتے تھے۔یہاں تک کہ ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا کہ اپنا اثاثہ فروخت کریں۔نتیجتاً ان کے مال کی قیمتیں گر جاتی تھیں (اس کے برعکس) میں ہر ایک پر صرف اس کی برداشت کے بقدر بار ڈالتا ہوں اور جس شخص کو اپنا مال فروخت کرنا ہوتا ہے وہ حسب مرضی فروخت کرسکتا ہے۔کہتے ہیں کہ اس پر میں نے یہ کہا، آپ ہمارے لیے نرخ متعین کر دیتے تو بہتر ہوتا۔آپ نے فرمایا اس سلسلہ میں ہمارا کوئی اختیار نہیں ہے نرخ اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے"۔(۶۰)

مذکورہ شواہد کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ قاضی ابو یوسف نے جن تعلیمات کو

اپنی کتاب میں پیش کیا ہے وہ یقیناً سماجی اور مذہبی ہم آہنگی کے لیے حد درجہ مفید ہیں۔غیر مسلم ذمیوں کے ساتھ اس دور میں اعتدال وتوازن برتا جاتا تھا اوران کے حقوق کا تحفظ کیا گیا اسی وجہ سے اسلامی ریاست کے حکمرانوں کے خلاف شورشوں اور بغاوتوں نے سرنہیں اٹھایا۔کیونکہ ان کی معاشی اور دیگر بنیادی ضروریات کی تکمیل اسلامی حکومت کے بیت المال سے کی جاتی تھی۔

عبادت گاہوں کا تحفظ: قاضی ابو یوسف سے امیر المومنین نے سوال کیا جب مسلمانوں نے مختلف ممالک فتح کیے تو شہروں اور مرکزی مقامات پر ذمیوں کے گرجا گھر اور معابد کیوں رہنے دیے گئے۔انہیں منہدم کیوں نہیں کیا گیا اور یہ کہ ان کو اپنے تیوہار کے مواقع پر صلیب لے کر چلنے کی اجازت کیوں کر حاصل رہی؟ قاضی ابو یوسف نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں اور ذمیوں کے درمیان جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح ہوئی تھی یہ ممالک اس شرط پر مسلمانوں کے حوالہ کیے گئے تھے کہ ان لوگوں کے گرجا اور بیعے باقی رہیں گے خواہ وہ شہروں کے اندر واقع ہوں یا باہر نیز یہ بھی طے ہوا تھا کہ ان کی جان محفوظ رہے گی اور اگر کوئی دشمن ان پر حملہ کرے تو اس سے جنگ کر کے اس کا دفاع کیا جائے۔دونوں فریقین کے مابین انہی شرائط پر صلح ہوئی۔ان لوگوں نے مسلمانوں کو جزیہ ادا کیا مسلمانوں نے ان کے لیے ان شرائط پر مشتمل ایک دستاویز لکھ کر دی ہے۔(۶۱) اہل ذمہ کی موجودہ عبادت گاہوں کے متعلق قاضی ابو یوسف نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

> ”ذمیوں کی جو عمارتیں ان صلحوں کے تحت آتی ہیں ان کو منہدم نہیں کرنا چاہیے ان کے سلسلہ میں اسی پالیسی پر عمل درآمد ہونا چاہیے جس پر ابوبکرؓ،عثمانؓ اور علیؓ نے عمل کیا ہے۔ان حضرات نے کسی ایسی عمارت کو منہدم نہیں کرایا جو صلح کے تحت آتی تھی۔رہے وہ گرجا گھر اور بیعے جن کی تعمیر صلح کے بعد عمل میں آئی ہے تو ان کو منہدم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔
>
> ماضی میں متعدد خلفا نے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنا چاہا جو مرکزی شہروں اور دوسرے قصبات میں پائے جاتے ہیں لیکن ان شہروں کے باشندوں نے وہ دستاویزیں نکال کر پیش کیں جو ان کے اور مسلمانوں کے مابین صلح کی شرائط پر مشتمل ہیں۔تابعین اور فقہا نے بھی اس ارادہ کی مذمت کی ہے چنانچہ خلفا ایسا کرنے سے باز رہے“۔(۶۲)

اس حوالہ سے قاضی ابو یوسف نے چند معاہدات کا تذکرہ کیا ہے جو تاریخ کی دیگر کتب میں بھی موجود ہیں۔ یہاں یہ عرض کرنا درست ہے کہ مذہبی آزادی انتہائی ضروری امر ہے اگر کسی بھی معاشرہ میں اس کے مذہب پر پابندی لگادی جائے تو خود بخود معاشرہ کا امن تباہ ہوجائے گا، اسلامی حکومت کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں بھی غیر مسلموں کو ان کے مذہبی امور پر پابندی نہیں لگائی گئی ہے۔ ضمناً یہ مسئلہ بھی بیان کردوں کہ قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے کہ اہل عجم کے مسلمانوں کے مرکزی شہروں میں کسی نئے گرجا گھر یا بیعہ کی تعمیر کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ جو بڑے شہر اہل عرب نے خود بسائے ہیں اس میں ان کو کسی گرجا یا بیعہ کی تعمیر عمل میں لائے، ناقوس بجائے، علانیہ شراب پیے یا سور رکھنے کا حق نہیں، البتہ جو شہر عجمیوں نے آباد کیے تھے اور بعد میں اہل عرب نے انہیں فتح کرلیا اور عجمیوں نے انہیں حاکم مان کر ہتھیار ڈال دیے۔ انہیں وہ حقوق حاصل ہیں جو ان کے صلح نامہ میں درج ہیں اور اہل عرب کی یہ ذمہ داری ہے کہ صلح نامہ میں مذکورہ تمام شرائط کی پابندی کریں۔(۶۳)

قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک: قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے:

> ’’جو افراد اس حال میں ہوں کہ ان کے پاس کھانے کے لیے اور زندگی کی دیگر حاجات کی تکمیل کے لیے کوئی ساز وسامان نہ ہو تو ان کے لیے صدقہ یا بیت المال کی دوسری مدّات سے کچھ انتظام کرنا ضروری ہے خواہ یہ نظم صدقہ کی مد سے ہو یا بیت المال کی دوسری مدات سے دونوں کی گنجائش ہے۔ میرے نزدیک زیادہ بہتر یہ ہے کہ آپ ایسے فرد کے لیے بیت المال سے بقدر ضرورت روزینہ مقرر کردیں۔ اس کے علاوہ کوئی سلوک نہ جائز ہوگا نہ اس کی گنجائش ہے۔
>
> (تصور کیجیے) ہمارے یہاں جو قید میں ہوں ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے وقت ناگزیر ہوتا ہے کہ ان کو خوراک بہم پہنچائی جائے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، پھر اگر مسلمانوں سے کوئی غلطی سرزد ہوجائے تو اس کے ساتھ دوسرا سلوک کیسے مناسب ہوسکتا ہے؟ کیا اسے بھوکوں مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے؟ حالانکہ اسے اس حال میں مبتلا کرنے کی ذمہ داری تقدیر پر ہے۔ امیر المومنین! سارے خلفا قیدیوں کے لیے اتنا روزینہ جاری کرتے رہے ہیں

جس سے روٹی، سالن اور جاڑے گرمی کی پوشاک فراہم کرنے کے لیے کام چل سکے۔ اس طرح کا انتظام سب سے پہلے علیؓ ابن ابی طالب نے عراق میں کیا تھا، پھر معاویہ نے شام میں ایسا ہی کیا پھر ان کے بعد سارے خلفا ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔(۶۴) آگے لکھتے ہیں ''آپ ان کے روٹی اور سالن پر آنے والے مصارف کا تخمینہ طلب کیجیے اور اس حساب سے ان کو ہر ماہ ایک مقررہ نقد رقم دینے کا حکم جاری کر دیجیے۔ اگر آپ ان کے لیے روٹیاں بھجوانے کا اہتمام کریں گے تو قید خانہ کے نگراں اور سپاہی اسے اڑا لیں گے، آگے یہ بھی لکھا کہ میری رائے میں فی کس دس درہم ماہانہ کا وظیفہ کافی ہوگا یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر قیدی روزینہ کا محتاج نہیں ہوتا پوشاک کے لیے ان لوگوں کو جاڑے میں ایک قمیص اور ایک لبادہ اور گرمی میں ایک قمیص اور ایک تہبند دیا جائے عورتوں کا وظیفہ بھی اتنا ہی رکھا جائے البتہ ان کی پوشاک جاڑے میں ایک قمیص، ایک اوڑھنی اور ایک لبادہ اور گرمی میں ایک قمیص، ایک تہبند اور ایک اوڑھنی''۔(۶۵)

یہ ہے اسلام کا نظام عدل کہ قیدیوں کو بھی پورے طور پر محفوظ و مامون رکھا جاتا ہے دنیا کے دیگر نظام میں اس طرح کی صورت حال نہیں ملے گی۔

مستامن کا حکم: قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے کہ:

''ایک حربی اپنے ملک سے نکل کر دارالاسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے اور راستہ میں اس کا گزر مسلمانوں کی کسی فوجی چھاؤنی سے ہوتا ہے خواہ یہ چھاؤنی عام راستہ میں واقع ہو یا کسی اور جگہ، یہ حربی پکڑا جاتا ہے اور یہ بیان دیتا ہے کہ میں اپنے اور اپنے اہل خانہ کے لیے امان طلب کرنے کے لیے دارالاسلام جا رہا ہوں یا یہ کہتا ہے کہ میں قاصد ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ حربی شخص چھاؤنی سے گزرتے وقت وہاں کے لوگوں سے بچ کر نکل جانا چاہتا ہو تو اس کی بات تسلیم نہیں کی جائے گی اور اگر اس نے بچ کر نکلنے کی کوشش نہیں کی تو اس کی بات تسلیم کی جائے گی، اگر وہ یہ کہے کہ میں اپنے بادشاہ کا قاصد ہوں اور اس نے مجھے عرب کے بادشاہ کے پاس بھیجا ہے اس کا خط میرے پاس ہے اور میرے ہمراہ

جو ساز و سامان ہے وہ ہدیہ میں بھیجا ہے تو اس کی بات تسلیم کی جائے گی۔(۶۶)
آگے قاضی ابو یوسف انتہائی اہم بات لکھتے ہیں کہ دارالاسلام میں امان لے کر یا
قاصد بن کر آنے والا چوری یا زنا کا مرتکب ہو جائے تو بعض فقہا کی رائے یہ ہے
کہ اس پر حد تو جاری نہیں کی جائے گی البتہ مال مسروقہ کو صرف کرڈالا ہو تو اسے
اس کی قیمت ادا کرنے کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص امان لے کر
دارالاسلام میں آیا ہے وہ اگر عورت ہو اور کوئی مسلمان اس کے ساتھ زنا کرے تو
میرے نزدیک اور دوسرے فقہا کے نزدیک بھی اس پر حد جاری کی جائے گی‘‘(۶۷)

مذکورہ عبارت کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں غیر مسلموں کے حقوق اور ان کی جان و مال کی حفاظت کی کس قدر اہمیت ہے۔

دوران جنگ تحفظ نفس: قاضی ابو یوسف نے اس سلسلہ میں حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سپہ سالاروں کو روانہ کرتے وقت تقوی اختیار کرنے اور جو مسلمان ہوں ان سے اچھا برتاؤ کرنے کی تلقین فرماتے نیز یہ فرماتے کہ اللہ کا نام لے کر اللہ کی راہ میں، اللہ سے کفر کرنے والے کے ساتھ جنگ کرو، حملہ کرتے وقت خیانت نہ کرنا، غداری نہ کرنا، مثلہ نہ کرنا اور کسی عورت یا بچے کو قتل نہ کرنا۔ اسی طرح یہ بھی لکھا ہے کہ جنگ میں بچوں اور بہت بوڑھے افراد کو قتل نہیں کیا جائے گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا لشکر روانہ کرتے وقت فرماتے خانقاہ نشینوں کو قتل نہ کرنا،(۶۸) حتی کہ مصنف علام نے یہاں تک لکھا ہے کہ کسی قیدی کو قتل کرنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناپسند فرماتے تھے۔

امان دینے کا طریقہ: ذمی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

’’مسلمان جن ذمیوں سے اپنی جنگ میں مدد لے رہے ہوں وہ دشمن کو
امان نہیں دے سکتے، ذمیوں کی دی ہوئی امان مسلمانوں پر کوئی ذمہ داری عائد
نہیں کرتی۔ غلام کے متعلق رقم طراز ہیں کہ غلام اگر لڑائی میں عملاً شریک ہو تو اس
کا امان دینا درست ہوگا، عورت کے بارے میں صاحب کتاب نے لکھا ہے کہ
عورتوں کی دی ہوئی امان درست ہے اور استدلال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی
حدیث پیش کی ہے۔
زینبؓ نے اپنے شوہر کو اور حضرت ام ہانیؓ نے اپنے شوہر کے دو بھائیوں کو

امان دی تھی (جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درست فرمایا تھا)۔

اسی طرح نابالغ اور قیدی کی امان کے متعلق لکھا ہے کہ یہ دونوں امان دینے کے مجاز نہیں ہیں، اسی طرح وہ مسلمان قیدی جو دشمن کے قبضہ میں ہوں نیز وہ مسلمان تاجر جو دارالحرب میں ہوں ان کی دی ہوئی امان مسترد کردی جائے گی۔ صاحب کتاب نے آگے مسئلہ بیان کیا ہے کہ امان دینے لے کر کا طریقہ کیا ہونا چاہیے، مثلاً اگر کوئی آدمی ہاتھ کے اشارہ سے کسی کو امان دینے کا اظہار کرے اور زبان سے اس کی صراحت نہ کرے تو اس کے بارے میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے مگر اس سلسلہ میں صاحب کتاب کی رائے یہ ہے کہ اس طریقہ کو امان دینا تسلیم کیا جائے گا، اسی طرح امان دینے والا گر فارسی زبان میں امان دے تو بھی اس کی امان تسلیم کی جائے گی۔ امان کے الفاظ کے متعلق صاحب کتاب نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ''لاتوجل'' یا ''لاتخف'' تو مذکورہ الفاظ کا یہ مطلب نکالا جائے گا کہ اس نے اسے امان دی ہے''۔(۶۹)

مراجع وحواشی

(۱) قاضی، یعقوب بن ابو یوسف، کتاب الخراج، اردو ترجمہ، مترجم نجات اللہ صدیقی، بعنوان اسلام کا نظام محاصل، مطبع پاکستان ٹائمز پریس لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۷ و ۲۸۔ (۲) ایضاً، ص ۳۱۔ (۳) ایضاً، ص ۳۶، ایک دوسری روایت کے مطابق خلیفہ مہدی نے آپ کو اپنے لڑکے اور ولی عہد موسی الہادی کا اتالیق مقرر کیا تھا اور ساتھ ہی آپ جرجان میں عہدۂ قضا پر بھی مامور تھے، جب ہادی خلیفہ ہوا تو آپ کو اپنے ہمراہ بغداد لایا، ہادی کے دور اقتدار (۱۶۸ھ-۱۷۰ھ) میں آپ پورے بغداد کے قاضی بنادیے گئے، پھر جب ہارون رشید خلیفہ ہوا تو اس نے ایک سال بعد ۱۷۱ھ میں قاضی القضاۃ کا عہدہ دے دیا اور اسی عہدے پر آپ اپنی وفات تک فائز رہے۔ (۴) ایضاً، ص ۴۵۔ (۵) ایضاً، ص ۴۶، یہ کتاب امام اعظم ابوحنیفہ کی روایت کی ہوئی ہے۔ احادیث پر مشتمل ہے جسے ابو یوسف کے صاحبزادے ابومحمد یوسف بن یعقوب (م ۱۹۳ھ) نے اپنے والد سے روایت کیا ہے۔ بعض احادیث خود قاضی ابو یوسف کی روایت کی ہوئی بھی ہیں۔ اس کا دوسرا نام مسند ابو یوسف ہے اور اسے مسند ابوحنیفہ بھی کہا جاتا ہے اس میں بعض ایسی احادیث بھی ہیں جو احادیث کے دوسرے مجموعے میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۵۵ھ میں لجنۃ الاحیا المعارف النعمانیہ، حیدرآباد دکن کے زیر اہتمام چھپی ہے

اور بڑی تقطیع کے ۲۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب ۳۹/ابواب اور ۱۰۶۲/فقروں پر مشتمل ہے، اس میں ۱۱۸۹/ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ۲۷۲ صحابہ سے مروی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے اجتہادات کن حدیثوں پر مبنی تھے، احادیث سے استناد کے لیے ان کے سامنے کیا شرائط تھے اور ان کی نظر میں مرسل احادیثوں اور کسی صحابی کے فتویٰ کو کیا وزن حاصل تھا۔ (۶) ایضاً، ص ۴۷، یہ کتاب قوانین جنگ اور ان سے متعلق امور مثلاً امان و صلح، اہل حرب، مرتدین، باغیوں اور ذمی افراد وغیرہ کے احکام پر مشتمل ہے، امام اوزاعی نے اس موضوع پر امام ابوحنیفہؒ کی کتاب السیر کا رد لکھا ہے جس کے جواب میں ابو یوسف نے یہ کتاب مرتب کی، قاضی ابو یوسف کا طریقہ کار اس کتاب میں یہ ہے کہ وہ پہلے امام ابوحنیفہؒ کا قول نقل کرتے ہیں، پھر امام اوزاعی کا اعتراض اور ان کا قول اس کے بعد دلائل کے ساتھ ان کی تردید کرتے ہوئے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کو صحیح ثابت کرتے ہیں۔ یہ نادر کتاب جس کا قلمی نسخہ ہندوستان میں صرف ایک ہے لجنۃ الاحیاء المعارف النعمانیہ کے زیر اہتمام ۱۳۵۷ھ میں چھپی ہے اور ۱۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ (۷) ایضاً، ص ۴۸، یہ کتاب بھی لجنۃ المعارف احیاء النعمانیہ کے زیر اہتمام ۱۳۵۷ھ میں چھپی ہے۔ قاضی ابو یوسف نے اس کتاب میں اپنے دونوں اساتذہ کے فقہی اختلافات کو نقل کردیا ہے اور ہر مسئلہ پر بحث کرکے اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے اکثر مسائل میں انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کی رائے کی تائید کی ہے البتہ کہیں کہیں قاضی ابی لیلیٰ کی رائے کو بھی ترجیح دیتے ہیں ہر مسلک کے دلائل پوری طرح وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں۔ (۸) ایضاً، ابو یوسف کی طرف ایک کتاب حیل کے موضوع پر بھی منسوب ہے جس کے قلمی نسخے مصر کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

اسی کتاب کو المخارج فی الحیل کے نام سے جوزف شاخت نے ایڈٹ کرکے ۱۹۳۰ء لیپزگ سے شائع کی ہے شاخت نے اسے امام محمدؒ کی تصنیف بتایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ امام محمدؒ نے اس میں ابو یوسف کی کتاب الحیل کے بعض حصے شامل کرلیے ہیں سرخسی نے بھی امام محمدؒ کی کتاب الحیل کی نسبت درست تسلیم کی ہے۔

(۹) ایضاً، ص ۵۲۔ (۱۰) ایضاً، ص ۶۱-۶۲۔ (۱۱) ایضاً، ص ۶۲۔ (۱۲) ایضاً، ص ۶۲-۶۳۔ (۱۳) ایضاً، تفصیل کے لیے دیکھیے ص ۹۱-۹۵۔ (۱۴) حاجی، خلیفہ مصطفی بن عبداللہ کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون بیروت، مکتبہ المثنیٰ ۲/ ۱۴۱۵۔ (۱۵) ابن الندیم، ابوالفرج محمد بن یعقوب اسحاق، الفہرست فی اخبار العلماء المصنفین من القدماء والمحدثین واسماء کتبھم، تحقیق رضا تجدد مصر المکتبہ التجاریہ الکبری، ص ۶۰، ۶۱، ۱۱۲، ۱۴۵، ۱۵۰، ۲۰۸، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۸۳، ۳۰۳، ۳۰۴۔ (۱۶) الرفاعی، عبدالجبار، فھرست الاقتصاد الاسلامی، باللغۃ العربیہ مجلہ التوحید، قسط نمبر ۶، ص ۱۶۰۔ (۱۷) اسلام کا نظام

محاصل، ص ۶۰۔ (۱۸) قلعہ جی، محمد رواس قنیبی حامد صادق، معجم اللغۃ الفقہاء کراتشی، مطبع ادارہ القرآن و العلوم الاسلامیہ، ص ۱۹۴۔ (۱۹) کاندھلوی، محمد زکریا، اوجز المسالک الی مؤطا امام مالک، مطبع دار القلم، ج ۹، ص ۴۸۱۔ ۸۲۔ (۲۰) المجلس الاعلی للشؤن الاسلامیہ الموسوعۃ الفقہاء، قاہرہ، ۱۳۹۰ھ، ۱۹/ ص ۵۲۔ (۲۱) ابو یوسف، کتاب الخراج، مطبع بولاق، ۱۳۰۲ھ، ص ۲۳۵، یحییٰ بن آدم القرشی، کتاب الخراج، مکتبہ اعلمیہ لاہور، ۱۳۹۵ھ، ص ۱۹۹۔ (۲۲) ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۳۰۔ (۲۳) اسلام کا نظام محاصل، ص ۶۱۔ (۲۴) ڈاکٹر محمد ضیاء الدین الریس، الخراج والنظم المالیہ للدولۃ الاسلامیہ، مطبع دار الانصار، قاہرہ، ۱۹۷۷ء، ص ۳۰۴۔ (۲۵) محمد عثمان شبیر، احکام الخراج فی الفقہ الاسلامی، مطبع دار ارقم، کویت، ۱۴۰۶ھ، ص ۲۱۔ (۲۶) ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۲۵۔ ۲۹۔ (۲۷) الرجبی، عبد العزیز بن محمد، المرصد علی خزانۃ کتاب الخرج، تحقیق، الدکتور احمد عبید الکبیسی، مطبع احیاء التراث الاسلامی، ۱۹۷۳ھ، ج ۱، ص ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ (۲۸) الزیلعی، فخر الدین عثمان بن علی، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، مطبع الکبری الامیریہ بولاق، مصر، ۱۳۱۵ھ، ج ۳، ص ۲۷۳۔ (۲۹) ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۳۸۔ ۳۹۔ (۳۰) ابو المعالی الجوینی، امام الحرمین عبد الملک بن عبد اللہ، غیاث الامم، مطبع دار الدعوۃ، ص ۲۰۹۔ (۳۱) ابن اثیر، عز الدین ابو الحسن علی بن محمد، الکامل فی التاریخ، مطبع دار الکتاب العربیہ، بیروت، ۱۳۸۷ھ، ج ۴، ص ۵۶۹۔ (۳۲) ایضاً، ص ۱۶۳۔ (۳۳) ابو عبد اللہ محمد بن عبدود، کتاب الوزراء والکتاب، مطبع مصطفی البابی الحلبی، قاہرہ، ۱۳۵۷ھ، ص ۱۳۴۔ (۳۴) ابو النصر، عمر، ابن المقفع مطبع الحیاء، ۱۹۶۶ء، ص ۲۴۵ تا ۳۶۱۔ (۳۵) اس کے لیے دیکھیے ابو یوسف کتاب الخراج، ص ۴۴۔ (۳۶) ابراہیم البنا، تحقیق و تعلیق کتاب الخراج، دار اصلاح، ص ۱۱۔ (۳۷) ابو یوسف، کتاب الخراج ص ۴۴۔ (۳۸) ایضاً۔ (۳۹) ایضاً۔ (۴۰) ایضاً، ص ۲۰۔ (۴۱) اسلام کا نظام محاصل، ص ۱۰۶۔ (۴۲) ایضاً، ص ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ (۴۳ و ۴۴) ایضاً، ص ۱۱۹۔ ۱۱۰۔ (۴۵) ایضاً، ص ۱۱۳۔ (۴۶) ایضاً، ص ۱۲۹۔ (۴۷) ایضاً، ص ۱۳۴۔ ۱۳۷۔ (۴۸) ایضاً، ص ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ (۴۹) ایضاً، ص ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ (۵۰) ایضاً، ص ۱۴۸۔ (۵۱) ایضاً، ص ۱۵۳۔ (۵۲) ایضاً، ص ۳۵۹۔ (۵۳) ایضاً، ص ۳۴۹۔ (۵۴) ایضاً، ص ۳۵۴۔ (۵۵) ایضاً، ص ۳۵۸۔ (۵۶) ایضاً، ص ۳۵۴۔ (۵۷) ایضاً، ص ۳۸۳۔ (۵۸) ایضاً، ص ۳۸۴۔ (۵۹) ایضاً، ص ۳۸۷۔ (۶۰) ایضاً، ص ۳۸۸۔ (۶۱) ایضاً، ص ۳۹۰۔ (۶۲) ایضاً، ص ۳۹۹۔ (۶۳) ایضاً، ص ۴۱۰۔ (۶۴) ایضاً، ص ۴۲۸۔ (۶۵) ایضاً، ص ۴۳۲۔ (۶۶) ایضاً، ص ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ (۶۷) ایضاً، ص ۴۳۵۔ (۶۸) ایضاً، ص ۵۱۷۔ (۶۹) ایضاً، ص ۵۲۰ تا ۵۵۵۔

کلامِ کمال

مع تعارف وترجمہ

ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی

(۲)

۲۲۔بی بی عائشہ: سید فیروز ابن سید امجد کی والدہ ماجدہ تھیں۔سید محمد کمال لکھتے ہیں:''سید فیروز کی والدہ صاحبہ نے صدق وراستی کے ساتھ زندگی گزاری اور کمال کے ساتھ قبیلہ پروری اور خبرگیری کی رسم نباہی۔آخر کار ۲۴ر رمضان ۱۰۶۰ھ/ ۹ر ستمبر ۱۶۵۰ کو دنیا سے رخصت ہوئیں،وہ میری دادی لگتی ہیں۔میں نے ان کی تاریخ لکھی ہے:

چوں ام المومنین دہر از دہر شدہ در روضۂ قدس تبارک
غریبان جامۂ جان چاک کردند بدردِ ماتمش ہر خانہ یک یک
ہمہ اخلاق او بودہ بعالم چو خُلق فاطمہ خیر و مبارک
چو پر سیدم ز دل تاریخ فوتش دلم گفتا ''بہشتی بود بیشک''

''یعنی جب اپنے زمانے کی ام المومنین دنیا سے قبر مبارک میں چلی گئیں۔غریبوں نے ہر گھر میں ان کے درد وغم میں اپنی جان کے لباس چاک کردیے۔دنیا میں ان کے تمام اخلاق حضرت فاطمہ کی طرح اچھے تھے۔جب میں نے دل سے اُن کی تاریخ وفات دریافت کی۔میرے دل نے کہا''بہشتی بود بیشک''وہ بلا شبہ جنتی تھیں''۔

۲۳۔شیخ محمد اسماعیل: شیخ المشائخ شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر کی اولاد میں شیخ علاءالدین چشتی (م ۹۴۵ / ۱۵۳۹) جوکہ علاءالدین جواں مرد کے نام سے مشہور تھے،کے پوتے ہیں۔سید محمد کمال ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شیخ اسماعیل کو تیس سال سے بھی زیادہ ہوگئے کہ نوکری چھوڑ کر لاڈن
سرائے سنبھل میں ہمت و مروت اور اخلاق پر جمے ہوئے ہیں۔ مجھ پر بہت لطف
فرماتے ہیں آپس میں اکثر ملاقات رہتی ہے۔اسراریہ کی تکمیل کے پانچ سال بعد
(۱۰۶۴ھ) میں وہ دہلی چلے گئے اور وہیں ۷؍رمضان المبارک ۱۰۷۳ھ/ ۱۶۶۲
میں دنیا سے رخصت ہوئے ان کی نعش کو سرائے شیخ علاء الدین میں دفن کیا گیا۔
میں نے اللہ کے فضل سے ان کی تاریخ وصال کہی''۔(۶)

شیخ اسماعیل چون رفت از جہان ہرکشش اندر بہشت آسود گفت
بود بینا در رہِ دل، ہم دلم شیخ اسماعیل بینا بود گفت

''یعنی جب شیخ اسماعیل جہاں سے چلے گئے ہر کسی نے دعا دی کہ وہ بہشت میں آرام سے
ہیں۔ راہ دل میں وہ دانا بینا تھے تو میرے دل نے بھی (ان کی تاریخ وفات) ''شیخ
اسماعیل بینا بود'' کہی''۔

۲۴۔شیخ عبدالحکیم امروہوی: شیخ عبدالمجید علوی امروہوی کے مرید و خلیفہ تھے جو
امروہہ کے بڑے ولی اور ذی علم بزرگ اور حضرت شاہ شرف الدین معروف بہ شاہ ولایت کی اولاد
سے تھے۔محمد کمال کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔محمد کمال آپ سے ملنے اکثر امروہہ آتے
رہتے تھے۔محمد کمال نے شیخ طیب امروہوی کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

''میں شیخ ابّنؒ (ابوالفتح شیخ شاہ ابّن بدر چشت) کے عرس میں ہر سال جب
امروہہ جاتا، وہ نہایت گرم جوشی سے پیش آتے تھے۔ بڑی خوب صحبتیں گزرتی
تھیں۔ میں چار پانچ دن بعد لوٹ کر آتا تھا۔''(۷)

سید کمال نے ان کی بہت سی کرامات بھی بیان کی ہیں۔شاہ عبدالحکیم نے ۲۷؍ذی الحجہ
۱۰۷۰ھ/۲۳؍اگست ۱۶۶۰ میں جمعہ کے دن وفات پائی۔ان کی قبر شیخ عبدالمجید علوی کی قبر کے
پائتی عیدگاہ روڈ اندھیریہ مسجد میں ہے۔کمال سنبھلی نے انتقال پر ملال پر حسب ذیل دو رباعیاں کہیں:

سید کہ براہ فقر بر جا بود در زمرۂ اربابِ وفا یکتا بود
سالِ فوتش مطابقِ واقع بین ہاتف گفتہ کہ ''خادم الفقراء بود''

آن عبدالحکیم سید پاک نہاد　　کو در رہ حق پاے وفا نیک نہاد

بگذشت بہ بیست وہفتم ذی الحجہ　　در جمعہ از سال ہزار و ہفتاد

''یعنی سید عبدالحکیم جو فقیری میں مستقیم ومتوکل اور زمرہ اربابِ وفا میں یکتا تھے، ان کی تاریخِ وفات ہاتف نے ''خادم الفقراء بود'' کہی ہے''۔

وہ پاک فطرت سید عبدالحکیم جنھوں نے راہ حق میں کیا خوب قدم وفا رکھا، ۲۷/ذی الحجہ کو جمعہ کے دن ۱۰۷۰ھ میں گزر گئے۔

۲۵۔ شیخ طیب امروہوی: صالح اور جواں مرد تھے، صاحب ذوق وسماع شیخ عبدالمجید علوی کے مرید ومعتقد۔ فارسی زبان کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ فن معما گوئی میں کمال رکھتے تھے۔ محمد کمال نے لکھا ہے:

''شیخ طیب معمے کے فن میں کمال رکھتے تھے۔ ایک دن مجھے اس کے قواعد و ضوابط انھوں نے سکھائے۔ میں نے دوسرے دن سات معمے کہے اور انھیں دکھائے، حیران ہوئے اور بہت تعریف کی کیونکہ میں نے پہلی بار ہی یہ کہے تھے''۔ (۸)

یہ تینوں معمے سید محمد کمال سنبھلی کے انتخاب کلام میں آگے پیش کیے جائیں گے۔ شیخ طیب نے ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۰ میں شہادت پائی۔ سید کمال نے لکھا ہے کہ ان کے دوستوں نے امروہہ میں ان کی تاریخ وفات لفظ ''غم'' سے نکالی۔ اتفاقاً میں نے بھی سنبھل میں یہی تاریخ کہی:

چون گشت شہید طیب عاشقِ پاک　　او را شدہ شادی ز غم و مارا غم

تاریخ و فاتش چون زِ دل پرسیدم　　دل نعرہ زنان شد ز غم و گفتا غم

''یعنی جب عاشق پاک طیب شہید ہو گئے۔ انھیں تو غم سے خوشی مل گئی لیکن ہمیں غم ملا۔ جب میں نے دل سے ان کی تاریخ وفات پوچھی تو دل نے غم زدہ ہو کر نعرہ لگایا اور بولا ''غم''۔

سرزمین امروہہ کے ایک صوفی بزرگ سید فتح محمد امروہوی جو کہ سید محمد کمال کے پیرومرشد حضرت خواجہ عبداللہ خرد کے مرید ومحبوب تھے۔ اور ان ہی کے بڑے بھائی سید عبدالرزاق تھے، دونوں بھائیوں میں حد درجہ انس ومحبت تھی۔ سید محمد کمال نے لکھا ہے کہ:

''ان سید فتح محمد کو اپنے بڑے بھائی سے عجیب اتحاد و یگانگی اور محبت تھی کہ دونوں

ایک ہی سال ۱۰۶۱ھ (۱۶۵۱) میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ''بین اتفاق برادری'' اُن کی تاریخ وفات ہے جو کہ شیخ عبداللہ امروہوی نے کہی ہے۔ میں نے یہ قطعہ کہا: (۹)

سید عبدالرزّاق و شاہ فتاح چون بسالے بزیر قبر بخفت

سال تاریخ شان خرد مندے اتفاق برادری بہ بین گفت

''یعنی سید عبدالرزاق اور سید محمد فتح ایک ہی سال میں قبر میں سو گئے تو ان کی تاریخ وفات ایک خردمند نے ''اتفاق برادری بیں'' (بھائی چارے کا اتفاق۔ کہی ہے)''۔

۲۶۔ شیخ مصطفی بن ابراہیم سنبھلی: سنبھل کے مشہور بزرگ لوگوں میں سے تھے۔ بچپن سے ہی راہ تصوف کا شوق پیدا ہوا اور انھوں نے لڑکپن میں ہی اس راہ میں کافی فہم و فراست حاصل کر لی۔ نقشبندیہ سلسلے میں بیعت وارادت رکھتے تھے۔ ''اسرار یہ کشف صوفیہ'' میں سید محمد کمال نے بڑے تفصیلی حالات و واقعات لکھے ہیں۔ سید محمد کمال کے ساتھیوں اور برادرِ نسبتی (سالے) تھے۔ محمد کمال لکھتے ہیں کہ:

''مجھے شیخ مصطفی سے خاص محبت تھی اور خوب آپس میں ملاقاتیں رہتی تھیں وہ میرے رشتہ دار بھی ہیں میرے برادرِ نسبتی ہیں۔'' (۱۰)

سید محمد کمال لکھتے ہیں:

''وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے شہادت کی دعا کیا کرتے تھے۔ دوران کارزار ایک تیر تفنگ ان کی پیشانی میں آ کر لگا۔ حرف ''ہو'' مد کے ساتھ کہا اور شہادت کے مرتبۂ عالی سے مشرف ہو گئے۔ ۲۱ر ذی الحجہ ۱۰۴۸ھ/ ۲۶ مارچ ۱۶۳۹ میں نے واقعہ کے مطابق یہ تاریخ کہی: ان کی اور ان کے والدین کی قبریں دہلی میں شیخ فخرالدین کے قبر کے پائتی پر ہیں۔

مصطفی صاحبِ صفا و وفا اہل تسلیم بود مادر زاد

در جوانی ز لطف، ایزدِ پاک درے از فقر بر دلش بکشاد

عاقبت خورد زخم اندر دین حرف ''ہُوہ'' گفت و بارضا جان داد

بود وارستہ در طریقہ عشق رحمتِ حق بروحِ پاکش باد

سال تاریخ او خرد گفتہ مصطفی رفت زین جہان آزاد

''یعنی سید مصطفی مادرزاد اہل تسلیم، صاحب صفا و وفا تھے۔ جوانی میں ہی اللہ تعالیٰ کے لطف سے ان کے دل پر در دولت سرمدی کھل گیا تھا۔ آخر کار دین کی راہ میں شہید ہوئے۔ لفظ ''ہو'' کہا اور خوشی خوشی جان دے دی وہ طریقہ عشق میں وارستہ تھے۔ ان کی روح پاک پر رحمت حق ہو۔ ان کا سال تاریخ اسی لیے (میری) عقل نے کہا۔ ''مصطفی رفت زین جہان آزاد''، یعنی مصطفی اس جہان سے آزادی کے ساتھ چلے گئے''۔

۲۷۔ شیخ حسین سنبھلی: سلسلۂ چشتیہ میں شیخ امان اللہ چشتی کے مرید تھے۔ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن راہِ درویشی میں بڑے مستحکم الحال تھے۔ متوکلانہ زندگی گزارتے تھے۔ پہلے وہ لشکر (فوجی) تھے جب اس راہ میں داخل ہوئے صدق دل اور ہمت قوی کے ساتھ داخل ہوئے۔

جب شیخ حسین محمد ۱۳؍شوال ۱۰۷۵ھ/مئی ۱۶۶۵ کو دنیا سے چلے گئے اتفاق دیکھیے کہ سنبھل کے، اس مہینے میں چار شخص یکے بعد دیگرے رخصت ہوگئے، پانچ دن کے فرق سے شیخ حسین محمد ان میں سے دوسرے ہیں۔ میں نے یکجائی ان سب کی تاریخ کہی:

رفت عادل بہشتی شوال کز جہان رفتنش بطرزِ نیکو ست
پنج روز از پیش بہ پنج شنبہ شد حسین آنکہ بُد خدا را دوست
پنج روز از پیش بدو شنبہ رفت ہاشم کہ برگ گُل خوشبوست
پنج روز از پیش بآدینہ رفت قاسم کہ حافظ خوش اوست

''یعنی عادل ۸؍شوال کو چلے گئے۔ دنیا سے رخصتی بہت اچھے طرز پر ہوئی ہے۔ ان کے پانچ روز بعد پنج شنبے کو حسین محمد کا انتقال ہوگیا جو خدا دوست تھے۔ ان کے پانچ روز بعد دو شنبے کو ہاشم چلے گئے جو خوشبودار پھول کی پتی جیسے تھے۔ ان کے پانچ روز کے بعد جمعہ کے دن۔ قاسم جو اچھے حافظ قرآن تھے چل دیے۔ خواجہ شیراز حضرت حافظ نے سچ کہا ہے۔ دنیا میں ہر ایک کی باری پانچ دن ہے۔ میں سب کا سالِ وفات لکھتا ہوں، اگر کچھ کمی بیشی ہے تو وہ روایت میں ہے جو مجھے پہنچی ہے۔ سب سے پہلے (عادل) ''خادم الفقرا'' تھے۔ کہ بہت سوں نے ان سے نفع حاصل کیا۔ دوسرے (حسین محمد) کی تاریخ

''دوست خدا'' ہے، ان کا لقب بھی خدا نما ہے اور خوب ہے۔ تیسرے ہاشم کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا رضائے الٰہی ہی ان کی رضا تھی۔ چوتھے حافظ قاسم جو اچھے حافظ تھے۔ اور جو چاروں میں سب سے کم عمر تھے افسوس کہ وہ بھی چلے گئے۔ کمال، میں اللہ کے فضل سے حد درجہ خوش ہوں کہ دونوں جہاں میں اس کی ذات وحدہٗ میری مایا ہے''۔

۲۸۔ شیخ شاہی سنبھلی: قادری سلسلہ میں حضرت شاہ قمیص کے مرید و خلیفہ تھے، وہ نساج تھے۔ انتہائی درجہ سادہ اور منکسر المزاج۔ کپڑا بننا ان کا ذریعہ معاش تھا۔ لوگ بطور تبرک ان کا کپڑا خریدتے تھے کہ وہ با عمل درویش تھے اور قدیم درویشوں کی روش پر زندگی گزارتے تھے۔ سید محمد کمال نے لکھا ہے کہ ''ان کی آخری بیماری میں جب میں تیمارداری کے لیے حاضر ہوا تو وہ استحضار (مرض الموت) کی حالت میں تھے، میں نے معلوم کیا کیسی طبیعت ہے؟ کہا میں عاجز بندہ ہوں، عاجز بندہ ہوں، حد درجہ خاکساری و انکساری ان سے ٹپک رہی تھی۔ اسی حال میں ۲/ جمادی الآخر ۱۰۶۵ھ/۱۳/ مارچ ۱۶۵۵ میں چل بسے اور ان کی قبر ان کی وصیت کے مطابق ان کی اپنی جگہ میں جہاں انھوں نے بہت درخت لگا رکھے تھے، بنائی گئی۔

شیخ شاہی سالک راہِ خدا زین جہان با ہوش و آگاہی برفت
سال تاریخ وفاتِ آن بزرگ عقل گفتہ'' از جہان شاہی برفت''

''یعنی شیخ شاہی جو راہ خدا کے سالک تھے اس دنیا سے ہوش و حواس کے ساتھ چلے گئے۔ ان بزرگ کی تاریخ وفات عقل نے یہ کہی۔ ''از جہاں شاہی برفت'' شاہی دنیا سے چلے گئے''۔

۲۹۔ شیخ فتح اللہ سنبھلی: اپنے زمانہ کے جوانوں میں، صالح اور لطیف مزاج، فہیم و ظریف تھے۔ فارسی اور عربی میں سید محمد کمال کے استاد تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ سید محمد کمال نے یہ تین شعر ان کے نقل کیے ہیں جو قارئین کی دلچسپی کے سبب مع ترجمہ یہاں پیش ہیں۔

یاراں سخن از ترک محبت مکنیدم دل پیش خود نیست نصیحت مکنیدم
بر نشتر من داروے راحت مفشانید شرمندۂ ناسور محبت مکنیدم
ایں سبزہ نیست گرد اگرد رخت نیکو صف بستہ مورچہ ز پئے لشکر آمدہ

''یعنی اے دوستوں مجھ سے ترکِ محبت کی بات مت کرو۔ میرا دل میرے پاس ہی نہیں

مجھے (بیکار) نصیحت نہ کرو۔ میرے نشتر پر چین کی دوا مت چھڑکو۔ مجھے ناسورِ محبت کے آگے شرمندہ نہ کرو۔ یہ سبزہ نہیں جو تیرے چہرے کے اردگرد پھیل رہا ہے بلکہ مورچہ نے صف باندھ کر تیرے حُسن کی حفاظت کو لشکر مہیا کر لیا ہے"۔

سید محمد کمال ان کے بارے میں لکھتے ہیں: اگرچہ وہ قدوقامت میں زیادہ نظر نہیں آتے تھے بلکہ ان کا جثہ چھوٹا لگتا تھا لیکن دوڑنے بھاگنے کودنے اور کشتی کے فن میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ کوئی بھی پہلوان انھیں چت نہیں کر سکا تھا۔ جوانی میں اگرچہ وہ ان کاموں میں لگے رہے۔ مگر اُن کی حالت صلاح و سلامتی میں کسی طرح بھی کوئی فتور نہیں آیا تھا۔ ۱۰۴۴ھ/ ۱۶۳۴ء میں وفات پائی۔ سید محمد کمال نے ان کی مندرجہ ذیل تاریخ وفات کہی:

وائے از کار جہانِ بے مدار — داد از درد و غم جانکاہ داد
رفت از عالم جوانے پاکباز — کز غم او خاست از صد آہ داد
آسماں در ماتمش شد نیلگون — خاستہ از جان مہر و ماہ داد
سال فوتش چون طلب کردم زغیب — گفت ہاتف "فات فتح اللہ داد"

"یعنی جہانِ ناپائیدار کے کاروبار پر افسوس کہ اس نے جان کو پگھلا دینے والا درد و غم دیا۔ دنیا سے ایک پاکباز جوان رخصت ہوا ہے تو اس کے غم میں سیکڑوں طرف سے آہ و فریاد کی آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ آسمان کا رنگ اس کے ماتم میں نیلا پڑ گیا ہے۔ چاند سورج سے بھی فریاد کی صدائیں نکل رہی ہیں۔ جب میں نے غیب سے اُن کے وصال کا سال دریافت کیا تو ہاتف نے کہا۔ "فات فتح اللہ"۔

۳۰۔ شاہ بھیکا دہلوی: صاحب معنی با تصرف اور باوقار و باہیبت مجذوب تھے۔ سید محمد کمال نے لکھا ہے کہ:

"شروع شروع میں نواح شہر میں گشت لگاتے پھرا کرتے تھے اور جو زبان پر آتا تھا ہذیان سرائی کیا کرتے تھے۔ اسی میں بعض باتیں خالص معرفتِ الٰہی کی بھی کہہ جاتے جو ان کی سلامتِ عقل کی گواہ تھیں"۔ (۱۱)

۱۰۷۲ھ/ ۱۶۶۲ میں شاہ بھیکا دہلوی کی وفات ہوئی۔ سید محمد کمال نے یہ تاریخ وفات لکھی:

شاہ بھیکا کہ بود مستہلک چون شرف روز وشب بذات خدای
از مقامِ فنا بدارِ بقا رفت گوی کہ شد زجاے بجای
سال تاریخ او خرد گفتہ یکجا رفت شاہ بھیکا ہای

''یعنی شاہ بھیکا جو کہ روز وشب شیخ شرف الدین پانی پتی کی طرح ذات الٰہی میں مستہلک و مستغرق رہتے تھے جب اس دار فنا سے دار بقا کی طرف گئے تو گویا بس ایک جگہ سے دوسری جگہ جا بیٹھے۔ خرد نے ان کی سال تاریخ کہیں '' یکجا رفت شاہ بھیکا ہائے'' کہ شاہ بھیکا کہاں چلے گئے افسوس''۔

ان قطعات تاریخ ہائے وفات کے ساتھ ہی سید محمد کمال نے بہت سے قطعاتِ تہنیت، تاریخ ہائے ولادت اور تقریباتِ نکاح کی تاریخیں و دیگر موضوعات پر بھی برجستہ قطعاتِ تاریخ و رباعیات قلم بند کیں ہیں جو ''اسراریہ کشف صوفیہ'' میں مختلف مقامات پر موجود ہیں۔

۱۔ خواجہ غلام بہاء الدین محمد، خواجہ عبداللہ خرد کے فرزند تھے۔ بچپن میں ہی اپنے دادا حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کے مرید وخلیفہ شیخ الہداد سے بیعت کی۔ اس کے بعد اپنے والد کی صحبت سے فیض یاب ہو کر احوال عظیمہ کے مالک بنے۔ غلام بہاء الدین ایک قادر الکلام فارسی شاعر بھی تھے۔ ''شناسا'' تخلص کرتے تھے۔ دو فرزند تھے خواجہ علاء الدین محمد اور خواجہ حسام الدین محمد، سید محمد کمال نے لکھا ہے کہ ''دونوں (پوتے) میرے شیخ کے مقبول اور محبوب ہیں۔ ولایت اور ہدایت کے آثار دونوں کی پیشانی سے ظاہر ہیں۔

ان میں خواجہ علاء الدین محمد کی تاریخ ولادت ضیاء دہلوی نے لکھی تھی جو اس وقت کے مشہور شاعر اور عالم و فاضل تھے۔ خواجہ حسام الدین کی تاریخ ولادت ان کے والد خواجہ غلام بہاء الدین شناسا نے لکھی اور ایک قطعۂ تاریخ سید محمد کمال نے لکھا جو مندرجہ ذیل ہے:

چون حسام الدین برون آمد زغیب شادی آمد در دل و غمہا نہفت
دیدہ ہاے دوستان شد باغ باغ سینہ ہاے مخلصان گل گل شگفت
صد دعاے خیر از راہ نیاز بس دلِ من گفت کان مژدہ شنفت
ہم دلم تاریخ وے از روے صدق خواجۂ ابرار باز آمد بگفت

''یعنی جب حسام الدین پیدا ہوئے۔ دلوں سے غم دور ہوئے اور خوشیاں چھا گئیں۔ دوستوں کی آنکھیں باغ باغ ہوگئیں اور مخلصوں کے سینوں میں پھول کھل گئے۔ میرے دل نے بطور نیاز مندی سیکڑوں دعائے خیر دیں جب یہ مژدہ سنا اور میرے دل نے اُن کی تاریخ پیدائش بھی صدق محبت کے ساتھ ''خواجہ ابرار باز آمد'' کہی''۔

۲۔ سید محمد کاظم جو سید محمد کمال کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ان کے یہاں ایک فرزند کی ولادت ہوئی تو سید محمد کمال نے اس بچے کا نام حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام نامی کی مناسبت سے ''عبدالقادر'' رکھا اور مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ ولادت لکھا:

آمدی پور مبارک در جہان تا جہاں آباد اے جانی بزی
چون بشارت داد شاہ محیٔ دیں از طفیل قطب ربانی بزی
نام عبدالقادرت ہم شد ز غیب از قبول شاہ گیلانی بزی
سال تاریخ تولد ہا تف بگفت سید عبدالقادرِ ثانی بزی

''یعنی مبارک فرزند دنیا میں آیا جب تک جہاں آباد رہے (اے میری جان کے ٹکڑے) تو بھی زندہ رہے۔ جبکہ حضرت محی الدین نے تیری بشارت دی ہے تو ان قطب ربانی کے طفیل میں جیے تیرا نام عبدالقادر بھی غیب سے رکھا گیا۔ تو شاہ گیلانی کا مقبول ہوکر زندہ رہے جب تیری پیدائش کی تاریخ ہاتف غیب سے معلوم کی تو اس نے کہا ''سید عبدالقادرِ ثانی بزی''۔ سید عبدالقادر ثانی بزی کے اعداد سے ۱۰۶۸ھ برآمد ہوتا ہے''۔

سید محمد کمال نے اپنے چاروں فرزندوں کے نام تاریخی رکھے ہیں جیسا کہ سید کاظم کا نام تاریخی ہے، جس سے ۱۰۳۵ھ سن برآمد ہوتا ہے۔ دوسرے فرزند سید اعظم جو کہ ان کی حیات میں ہی وفات پا گئے تھے اور آپ نے ان کی وفات حسرت آیات پر ایک رسالہ بھی ''رسالۂ اعظم'' (متوفی: ۹/ستمبر ۱۶۴۸) کے نام سے تصنیف کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ سید محمد کمال صاحب کا اس رسالہ میں بھی خاصہ کلام موجود ہوگا۔ جو ابھی تک ہمیں دستیاب نہیں ہوسکا۔

۳۔ شیخ نظام مداری کی مسجد کی تاریخ۔ شیخ نظام ایک نیک کردار نوجوان تھے۔ حضرت شاہ بھیکا دہلوی سے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے پتھروں سے ایک عمدہ خانقاہ بنوائی

اوراسی سے ملحق ایک خوب صورت اور وسیع مسجد بھی تعمیر کی۔سید محمد کمال نے اس مسجد کا مادۂ تاریخ بِنا ''مقامِ فیض'' نکالا جس سے ۱۰۷۱ھ سن برآمد ہوتا ہے۔اسی مادۂ تاریخی کو ایک مصرعہ میں یوں نظم کیا کہ:

''مقامِ فیض'' شیخ من خوش کرد

یعنی، میرے شیخ کو ''مقامِ فیض'' نے خوش کیا۔

سید محمد کمال نے اس مسجد کے سنگ بنیاد کی مندرجہ ذیل تاریخ لکھی:

بنائے مسجد پُر فیض کرد شیخ نظام — کہ ہیچ گاہ مبادا ز صدائے ذکر خموش

چون سال این عملِ خیر جستم از ہاتف — ''مقامِ فیض'' رسید از ندائے غیب بگوش

''یعنی شیخ نظام نے اس پُرفیض مسجد کی بنیاد رکھی، اللہ کرے کہ کبھی بھی صدائے ذکر حق سے خاموش نہ ہووے تو میں نے ہاتف سے اس عمل خیر کی تاریخ بنا معلوم کی تو کان میں غیب سے ندا آئی ''مقامِ فیض'' (۱۰۷۱ھ)''۔

۴۔''فیروز پور'' یہ گاؤں سید فیروز سنبھلی نے سنبھل اور سرسی کے درمیان سوت ندی کے کنارے بسایا تھا۔سید فیروز ایک صوفی منش، اہل خیر اور حاکم سنبھل و مراد آباد رستم خاں دکنی کی فوج میں لشکری تھے۔سید محمد کمال کے ہم جدی اور قریبی عزیز تھے۔یعنی سید فیروز کی والدہ سیدہ بی بی عائشہ سید محمد کمال کی دادی ہوتی تھیں۔''اسرار یہ کشف صوفیہ'' میں مختلف مقامات پر سید فیروز کے علم و تقویٰ شعاری اور کنبہ پروری کی بہت تعریف لکھی ہے۔وہ شاہجہاں بادشاہ کے مقرب خاص تھے۔سید محمد کمال لکھتے ہیں۔''اس وقت سید فیروز مقرب و معزز بادشاہ وقت ہیں''۔

سید محمد کمال جب فیروز پور گئے تو اس جگہ کی سیر کرنے کے بعد اپنے تاثرات اس طرح قلم بند کیے۔''کیسی دل خوش جگہ ہے اور وہاں کی عمارتیں اور باغ کیا ہی دل کش ہیں''۔

اسی تاثر کے ساتھ سید محمد کمال نے مندرجہ ذیل رباعی ''فیروز پور'' کی تعریف میں لکھی:

فیروز پور است یا کہ فردوس بریں — معمورۂ ہند گشتہ و فخر زمیں

ہر قصر وے از قصر جنان دادہ نشان — ہر باغ وے از باغ ارم بردہ زیں

''یعنی یہ فیروز پور ہے یا فردوس بریں۔ہند کی رونق اور فخر زمیں ہے۔اس کا ہر قصر جنت

کے محل کا پتہ دیتا ہے۔اس کا ہر باغ، باغِ ارم کی زینت کو لیے ہوئے ہے''۔

۵۔''اسراریہ کشفِ صوفیہ'' سید محمد کمال جو ایک قادر الکلام شاعر اور صاحب طرز ادیب و محقق تھے۔''اسراریہ کشفِ صوفیہ'' کے ساتھ ہی سات فارسی اور ہندی نثر و نظم کی تخلیقات کے خالق ہیں۔ یہ ان کی دستیاب تصانیف میں مشہور و معروف تصنیف ہے جو انتہائی عالمانہ و محققانہ تاریخ و تذکرہ ہے۔جس میں بے شمار نادر و نایاب تاریخی احوال درج ہیں۔اس میں بعض ایسے صوفیہ و علما اور شعرا کے حالات مندرج ہیں جو ہمیں دوسرے کسی تذکرے میں نہیں ملتے۔ یہ شمالی ہندوستان کے مشاہیر صوفیہ کرام کے حالات زندگی اور میدان تصوف میں ان کے مقام و مرتبہ نیز صوفیانہ رموز و نکات پر مشتمل ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''سید کمال سنبھلی کی فارسی تالیف ''اسراریہ'' جو بدقسمتی سے آج تک شائع نہیں ہوسکی، تاریخ و تذکرے کی بہت اہم اور بیش قیمت معلومات سے بھرپور کتاب ہے، اس سے اس عہد کے کتنے ہی بزرگوں کے وہ حالات ہمیں معلوم ہوتے ہیں جو کسی دوسرے ماخذ میں نہیں ملتے۔''(۱۲)

''اسراریہ کشفِ صوفیہ'' کو سید محمد کمال نے اپنے پیر و مرشد خواجہ عبداللہ خرد کے ایما و اشارے پر ۱۰۶۸ھ/ ۱۶۵۷ء میں بعہد ابوالمظفر شہاب الدین شاہ جہاں بادشاہ صاحب قران ثانی ستاون سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا اور ایک سال کی قلیل مدت میں ۱۰۶۹ھ ۱۶۵۸ء میں مکمل کیا۔ اخیر میں سید محمد کمال نے خود ہی اس کا قطعۂ تاریخ لکھا:

رباعی

این نسخہ ذکر اہل دلہاے کرام — کز وے ہمہ بوے انس آید مشام
زان بوی رسید بادۂ مقصود بکام — در سال ہزار و شصت و نہ گشت تمام

''یعنی اہل دل حضرات کے ذکر میں یہ ایک نسخہ ہے جس سے بوئے انس الٰہی دل و دماغ تک آتی ہے، پھر اس خوشبوئے محبت سے شرابِ مقصد حلق تک پہنچ جاتی ہے یعنی مقصد وصل حاصل ہوجاتا ہے۔اس کا اتمام ۱۰۶۹ھ (۱۶۵۹ء) میں ہوا''۔

سید محمد کمال کو فن تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ تھا، وہ فی البدیہہ تاریخی مادہ کہہ دیتے تھے

بعض جگہ انھوں نے صرف مادہ ہائے تاریخ لکھنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ حضرت خواجہ عبداللہ خرد کے فرزند خواجہ محمد عاشق کی تقریب نکاح کے موقع پر سید محمد کمال نے برجستہ مادۂ تاریخ بطور مبارک باد کہا۔ وہ لکھتے ہیں ''ان کی شادی (نکاح) میں جو کہ ۱۰۶۸ھ میں ہوئی تھی میرے شیخ کی بشاشت اورنشاط قلب (قابل دید) اور دل کش تھی۔ اس میں میرے شیخ اور خواجہ بیرنگ کے دوستوں کی بڑی پُر رونق مجلس تھی۔ جب وقت نکاح آیا، میرے دل میں خیال آیا کہ شادیٔ نکاح کی تاریخ ایسی ہونی چاہیے جس کی عبارت مبارکباد پر مشتمل ہو لیکن تاریخ کہنے کے لیے وقت کم تھا (کیونکہ مبارکباد کا وقت، وقتِ نکاح ہی ہوتا ہے) میں نے اپنے شیخ کے باطن سے رجوع کیا، ایک لمحہ میں جتنی دیر میں نکاح پڑھا گیا برجستہ یہ جملہ میرے لبوں پر آ گیا۔ میں کھڑا ہوا اور اپنے شیخ سے مبارکباد کا مذکورہ جملہ ''صاحب من طوی محمد عاشق جیو مبارکباد'' عرض کیا۔ فرمایا ''تاریخ نکاح بھی یہی ہے'' میں نے کہا۔ ''جی ہاں'' میرے شیخ اور سارے حاضرینِ مجلس بہت خوش ہوئے''۔

دوسرے دہلی کے ایک بزرگ شیخ محمد قائم کے انتقال کی خبر سنتے ہی انہوں نے برجستہ مادہ تاریخ ''آہ شیخ قائم'' ۱۰۶۷ھ کہا۔ ان کی وفات ۱۰۶۷/ ۱۶۵۷ میں ہوئی تھی۔

جیسا کہ راقم الحروف کے اس مقالہ کی ابتدائی سطور میں عرض کیا گیا ہے کہ سید محمد کمال ایک ادیب و محقق ہونے کے ساتھ ہی اچھے قادر الکلام اور صاحب طرز شاعر بھی تھے۔ انہوں نے حسب موقع بہت سے قطعات رباعیات اور فارسی اور ہندی میں موضوعاتی اور نصیحت آمیز شاعری کی۔ یہاں سب سے پہلے ان کی فارسی غزل کا ایک نمونہ مع ترجمہ پیش ہے، جس سے ان کی بہت سی عالمانہ خوبیوں، راہ تصوف میں جامعیت اور صلح کل کے مسلک کے ساتھ ہی رحمت اللعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ عظمت شان میں ہوشیاری کا بھی پتا چلتا ہے۔ ''با خدا دیوانہ باش با محمد ہوشیار'' والا معاملہ ہے۔

منم کہ با ہمہ از ہمہ جدا شدہ ام ۔۔۔ چو مہر قدسم و چون ذرّہ جا بجا شدہ ام
بجان خواص خواصم بہ تن عوام عوام ۔۔۔ کہ تاج فقر بسر کردہ پادشاہ شدہ ام
ہمہ بکفر و باسلام صلحِ کل کردم ۔۔۔ برنگ ہر دو خوشم ہم ز ہر دو وا شدہ ام
نہ غیر ذاتم و نہ عین و نے فراق و نہ وصل ۔۔۔ گذشتہ از ہمہ مذہب و با خدا شدہ ام

چو بے خودم بخدا با محمد ہشیار ازین کمال کہ با وحدت آشنا شدہ ام

''یعنی میں وہ ہوں کہ سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی سب سے جدا ہو گیا ہوں۔ میں مہر قدسی ہوں ہر ہر ذرّے کے ساتھ باوجود سب سے جدا ہونے کے اپنی ضیا پاشی میں رہتا ہوں۔ میں خواص کے ساتھ خاص اور عوام کے ساتھ عام ہوں۔ فقر کا تاج سر پر باندھ کر بادشاہ بن گیا ہوں۔ باطنی طور پر میری کفر و اسلام سے صلح ہے اگرچہ دونوں رنگوں سے راضی ہوں مگر دونوں سے آزاد بھی ہوں۔ نہ تو میں غیر ذات ہوں نہ عین ذات۔ نہ جدا ہوں نہ واصل۔ تمام مذاہب سے گزر کر اللہ تعالیٰ کا ہو گیا ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں خود سے بے خود اور فانی ہوں لیکن شریعت محمدی کے معاملے میں پورا بیدار ہوں، باہوش ہوں۔ اس کمال جامعیت کے ساتھ میں وحدت سے آشنا ہوا ہوں''۔

سید محمد کمال ایک صوفی صافی تھے۔ ظاہری اور باطنی طور پر ایک متقی و زاہد اور خدا خواہ انسان تھے۔ ایک بزرگ نے ان سے اپنے بارے میں کہا کہ:

''اے فلاں (سید محمد کمال) بے تعینی کی یہ فقیر کی حالت خوب ہے کہ ظاہراً و باطناً ہر قید سے آزادی ہے۔''

شاعری کے میدان میں وہ خواجہ غلام بہاء الدین شناسا کی صوفیانہ شاعری بہت زیادہ پسند کرتے تھے اور انھیں اس فن کا استاد مانتے تھے۔ ایک مرتبہ مندرجہ ذیل رباعی ان کی خدمت میں یہ لکھ کر بھیجی کہ اپنی پسند و ناپسند سے مطلع فرمائیں۔

رباعی

گویند کہ ذاتِ صرف بے رنگ و نشان وین کثرت اشیاء ہمہ وہم است گمان
گر بے رنگ است ذات و اشیا وہم پس و پیش چہ ماند کن سرّے ازآن

ترجمہ: کہتے ہیں کہ ذات بحت (اللہ) بے رنگ اور بے نشان ہے۔ اور اشیا کی یہ کثرت بھی وہم و گمان سے زیادہ کچھ نہیں جبکہ ذات الٰہی بے رنگ ہے اور یہ چیزیں ایک وہم سے زیادہ نہیں۔ اب بتاؤ پھر کیا بچا، اسی سے حقیقت کا راز پا جا۔

اس کے بعد محمد کمال لکھتے ہیں کہ ''انھوں نے رباعی پسند فرمائی اور اس کی نہایت غامض

اور دقیق شرح تفصیل کے ساتھ لکھ کر بھجوائی۔

اب ہم ان کی کچھ رباعیات وقطعات اور دیگر اشعار پیش کرتے ہیں۔ ان کو اپنے پیرومرشد خواجہ عبداللہ خرد کے والد گرامی حضرت خواجہ محمد باقی باللہ سے بھی بے پناہ عقیدت اور والہانہ لگاؤ تھا۔ ایک جگہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے بہت سے مردان راہ سے بارہا سنا ہے کہ خواجہ بیرنگ قدس سرہٗ کے وجود عنصری (جسم) کی حرکت سے جس طرح کے تصرفات اور کیفیات ظاہر ہوتے تھے ویسے پہلے زمانوں کے بزرگوں اور کاملوں سے بھی ظہور پذیر نہ ہوئے ہوں گے۔ جب بھی آپ جنبش فرماتے، وہ کیفیات جو دوسروں سے بڑی توجہ و تصرف سے ظاہر ہوتی ہیں محض بدن سے ہی واقع ہو جاتی تھیں جب بھی آپ کوچہ و بازار سے گزرتے تھے۔ بچے کھیلنے سے رک جاتے تھے اور آپ کی جانب متوجہ ہو جاتے تھے بعضے تو پیروں میں آگرتے تھے اور مست و بیخود ہو جاتے تھے۔ دکانداروں کی آنکھیں بھی آپ پر گڑ جاتی تھیں اور اپنے کاروبار کو بھول جاتے تھے۔ ایک بار ایک راجپوت نے شیخ کو کہیں جاتے دیکھا، کھڑا ہو گیا اور بولا ''خدا اسی شکل کا ہوگا'' ایک بار میں نے یہ رباعی کہی تھی۔'' (۱۳)

اے خواجہ نقشبند و اے صاحبِ ما — اے خواجۂ احرار شہِ ملک بقا
اے خواجۂ بیرنگ محمد باقی — اے خواجہ خورد یک نظر بہرِ خدا

اس کے علاوہ محمد کمال نے یہ دو شعر اور بھی حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کی تعریف میں کہے ہیں کہ:

حبّ تو مرادِ ما محمد باقی — بر نام تو جاں فدا محمد باقی
فرمای بحال خستہ یکرہ نظرے — اے خواجہ خواجہا محمد باقی

> ''یعنی اے شیخ محمد باقی! کی محبت میری مراد ہے، ان کے نام پر میری جان فدا ہے، اے خواجہ خواجگان! مجھ خستہ حال پر ایک نظر فرمائیں''۔

حضرت شیخ نورالحق ابن حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی جو ایک عالم و فاضل اور

فارسی زبان کے بہترین شاعر تھے۔ان کی ایک رباعی درج ذیل ہے:

از شیوہ ہمدمان این دہر خلاف   گویم رمزے اگر نگیری بگذاف

چون شیشہ ساختند پیوستہ بہم   دلہا ہمہ پر غبار و روہا ہمہ صاف

''یعنی اس الٹے زمانے کے ہمدموں کے شیوہ ہم نشینی کو میں اشارتاً کہتا ہوں اگر تو میری بات جھوٹ نہ جانے۔یہ شیشے کی مانند آپس میں بظاہر صاف ستھرے ملے جلے ہیں، دلوں میں غبار بھرے ہیں اور چہرے بالکل صاف ہیں''۔

سید محمد کمال نے لکھا ہے کہ:

مجھے اس وقت یہ رباعی بہت پسند آئی تھی تو میں نے بھی اس کے تتبع میں ایک رباعی کہی:

از شیوہ عاشقان معشوق اوصاف   گویم رمزے بشنو بگوش انصاف

در آتش شوق کیمیا بوتہ و شند   روہا ہمہ پُر غبار و دلہا ہمہ صاف

''یعنی میں عاشقانِ معشوق اوصاف کے طریقے کو بطور رمز کہتا ہوں گوش انصاف سے سنیے۔ کیمیا (سعادت) کے شوق میں بوتے (سنار کی کٹھالی) کے مانند ہوگئے ہیں بظاہر بالکل خراب وخستہ اور حقیقت میں بالکل صاف شفاف''۔

سید محمد کمال نے اپنے ایک دوست اور پیر بھائی شیخ معظم کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ:

میرے ایک دوست شیخ کے مرید شیخ معظم نام جو لشکری ہیں صاحب صدق و راستی، راہ شریعت پر گامزن بڑے فہیم اور ظریف ہیں ان کا ایک بیٹا عادل بڑا قابل نوجوان تھا وہ بھی شیخ ہی سے بیعت تھا۔اس کا ۱۰۶۶ھ (۱۶۵۶) میں انتقال ہوگیا اس دن میں بھی اپنے شیخ کے ساتھ (اس موقع پر) حاضر تھا۔نہ انھوں نے آہ کی نہ آنکھ تر کی۔بیٹے کی تجہیز و تکفین ایسے کی کہ غم کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا تھا اور خواجہ بیرنگ کے آستانے میں دفن کر دیا۔شیخ معظم نے ایک مصرع کہا اور مجھ سے کہا رباعی پوری کرو، میں نے کر دی:

در مکتب عشق قدس دانای نیست   تعلیم توی و خواندن مای نیست

از پردۂ علم بگذر و عین شناس   کانجا وجودِ غیر گنجای نیست

''یعنی عشق الٰہی کے مکتب میں دانائی نہیں پڑھائی جاتی۔یہاں، میں، تو کی یعنی غرور و غیریت

کی تعلیم نہیں دی جاتی، علم کے پردوں سے گزر کر حقیقت کو پہنچان، کہ حقیقت میں دوئی کی گنجائش ہی نہیں ہے''۔

اس رباعی سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید محمد کمال کا عشق الٰہی کیسا بلند تھا اور وہ علم اور حقیقت کو کس طرح پہچانتے تھے۔ اسی معنی و مفہوم کی ایک اور رباعی ملاحظہ ہو:

آنکس کہ بعشق دوست گم گشت کس است — وان کس کہ بگفت یافتم بوالہوسست

بہتر کہ ازین گفت و شنو درگذرم — نایافت او یافتم این یافت بس است

''یعنی جو دوست کے عشق میں گم ہو گیا وہ واقعی آدمی ہے اور جس نے کہا کہ میں نے دوست کو پالیا، وہ بوالہوس ہے، جھوٹا ہے۔ یہی بہتر ہے کہ اس گفت و شنید سے گزر جاؤں۔ اس کا نہ ملنا ہی ملنا ہے یہی یافت کی انتہا ہے''۔

سید محمد کمال حضرت شاہ ابن بدر چشتی کے پوتے سید غوث عالم کی خاکساری و بردباری کی صفات بیان کرتے ہوئے نام نہاد صوفیہ، ظاہری قلندر اور ان لوگوں کی بھی بھرپور مذمت کرتے ہیں جو صوفیہ کرام کی ناقدری کرتے اور ان کو بُرا بھلا کہتے ہیں، مندرجہ دو اشعار میں انہوں نے اسی مفہوم کو واضح کیا ہے:

این ملحد گان کہ سر برافراشتہ اند — خود را بخودی موحد انگاشتہ اند

بے قیدئ شان شور و شر و حرص طمع — جز قید بروت و ریش نگذاشتہ اند

''یعنی یہ ملحد لوگ جو سر اُٹھائے پھر رہے ہیں اور خود کو بزعم خود موحد سمجھ رہے ہیں۔ شریعت سے ان کی آزادی، شور و شر، حرص و طمع نے علاوہ موچھیں کٹانے اور داڑھی بڑھانے کے کچھ باقی نہیں چھوڑا۔ یعنی بالکل اتباع شرع شریف سے محروم ہو گئے''۔

سرزمین سنبھل میں ایک جگہ کا نام ''شاہ مدار کا ٹیلہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ سید محمد کمال کو حضرت بدیع الدین شاہ مدار کے عرس کے موقع پر ایک بار حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں اپنے دیدار سے مشرف کیا تھا اس واقعہ کو خود سید محمد کمال کی زبانی سنیے وہ لکھتے ہیں:

''میں نے جوانی کے دنوں میں خواب دیکھا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تخت اس تکیے (ٹیلے) پر اُترا ہے۔ اسی زمانے میں مجھے شاہ مدار کے عرس کی رات کو

اسی تکیے پر وصل معشوق (حقیقی) نصیب ہوا کہ اس نعمت کا شکر بیان سے ورا ہے۔
اس رات کی حکایت دراز ہے۔ یہاں اس کے بیان کی گنجائش نہیں۔ میں نے اس موقع کے متعلق بہت سے اشعار کہے ہیں۔ یہ قطعہ ان میں سے ایک ہے"۔ (۱۴)

بر تکیہ گاہ شاہ مدار وبعرس وے — ناگاہ رخ نمود مرا آنکہ ماہ بود
بل وے بہ تکیہ گاہ خودم داد وصل یار — گویا مدار کارمن آں تکیہ گاہ بود

"یعنی شاہ مدار کے تکیے پر ان کے عرس (کی رات) میں، میرے چاند نے اچانک مجھے جلوہ دکھایا بلکہ یوں کہیے کہ شاہ مدار کی روحانی توجہ نے مجھے وصل یار سے مالا مال کر دیا گویا کہ میرے کام کا مدار ان کی تکیہ گاہ تھی"۔

محمد کمال نے اپنے پیر و مرشد کو ڈھیر سارے خطوط بھی لکھے، ایک خط میں راہِ طریقت کے بہت سے سوال اپنے پیر خواجہ عبداللہ خرد سے معلوم کیے اور راہ تصوف میں خود پر وارد ہونے والے مقامات کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر نظم کیے:

در راہ حق جملہ ادب باید بود — تا جان باقیست در طلب باید بود
در یکدم اگر ہزار در یابکشی — طلب کم نباید در طلب باید بود

"یعنی راہ حق میں سراپا طلب بن جانا چاہیے۔ جب تک جان میں جان ہے طلب میں سرگرم رہنا چاہیے۔ اگر ایک سانس میں ہزاروں دریا بھی پی جائے تب بھی طلب کم نہ ہو، طلب رہنی چاہیے"۔

عہد شاہ جہانی میں محمد شریف خاں جو ایک بہادر فوجی تھے، بڑی بڑی جنگوں میں شریک ہو کر بہادری اور تہور کے نمایاں کارنامے انھوں نے انجام دیے اور آخر میں ملازمت ترک کر کے خواجہ حسام الدین ابرار کی صحبت بابرکت میں آئے اور گوشۂ گمنامی میں زندگی گزاری، ان ہی کے ذکر میں سید محمد کمال نے لکھا ہے کہ:

شیخ دوست محمد میرے شیخ کے مخلص و صادق دوست تھے اور چھپ کر فقرا کو صدقہ کرتے تھے۔ اور نہایت صاحب فہم تھے۔ ان کا سال وفات ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰) ہے، وہ ان کی مجلس نکاح میں آئے ہوئے تھے میں بھی اپنے شیخ کے ہمراہ تھا۔ میرے شیخ، محمد شریف خاں سے مل کر بیٹھے تھے

کہ خواجہ ابرار بھی تشریف فرما ہوگئے تینوں بزرگ یکجا ہوگئے تو یہ مجلس بڑی پُر رونق ہوگئی اور صحبت یاراں اس سے بھی خوب تر۔ میں جوان تھا اور یہ میری اپنے شیخ کے ساتھ اوائل صحبت کا زمانہ تھا۔ اس اجتماع بزرگان نے میرا دل موہ لیا اور میں بے اختیار کہہ اُٹھا:

دیدار این سہ مرد مرا یاد حق نمود　　　آرے با جتماعِ سِرّ راست معرفت

''یعنی ان تینوں بزرگوں کے دیدار سے مجھے اللہ یاد آ گیا۔ ہاں ہاں معرفت (بزرگوں کے) اجتماع دلی کے ساتھ ساتھ ہے''۔

اس موقع پر مجھے اپنی ہی غزل کا ایک شعر یاد پڑتا ہے جسے میں نے کسی کے تتبع میں کہا تھا استاد شاعر کا مطلع یہ ہے:

کہنہ شد خرقہ و تسبیح و مصلا ہر سہ　　　بایدم میکدہ و ساقی و صہبا ہر سہ

''یعنی یہ خرقہ، تسبیح اور مصلا تینوں پرانے ہو چکے ہیں اب مجھے در میکدہ، ساقی اور شراب چاہیے''۔

اور میرا شعر یہ ہے کہ:

تا بدیدیم رخ و سبزہ و لعلِ لبِ تو　　　یوسف و خضر و مسیحا شدہ یکجا ہر سہ

''یعنی جب میں نے تیرا چہرہ، سبزۂ رخسار اور سرخ لب دیکھے ایسا محسوس ہوا ہے گویا یوسف علیہ السلام خضر علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام ہر سہ کا اجتماع ہو گیا ہے''۔

اس شعر میں بڑی خوب صورت اور بلیغ تین تلمیحات کا استعمال ہوا ہے یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کا خوب صورت اور پاکیزہ چہرہ، ہمیشہ رہنے والا سبزہ حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے موتی جیسے معجز نما ہونٹ۔

محمد کمال نے اپنے پیرو مرشد حضرت خواجہ عبداللہ خرد اور ان کے والد گرامی حضرت خواجہ محمد باقی باللہ (متوفی ۲۵ر جمادی الثانی ۱۰۱۲ھ/ ۳۰ر دسمبر ۱۶۰۳ء) کی شان میں کئی طویل قصائد بھی کہے ہیں مگر افسوس ہمیں وہ کلام ابھی دستیاب نہیں ہوا۔ البتہ انھوں نے ''اسراریہ کشف صوفیہ'' میں مضمون کی مناسبت سے جو اشعار نقل کر دیے ہیں وہی یہاں پیش ہیں۔ اپنے شیخ خواجہ خرد کی ایک مسلسل اور طویل غزل کے چودہ اشعار نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ''میں نے بھی اس کے تتبع میں ایک قصیدہ کہا ہے:

حب الی قطب رابشانِ بداہ ہست تمثالی حبتہ البلقا

سید محمد کمال نے شاعری کی دیگر اصناف میں مثلاً فن معما گوئی میں بھی طبع آزمائی کی، شیخ طیب امروہوی کے ذکر میں لکھتے ہیں: شیخ طیب معمے کے فن میں کمال رکھتے تھے۔ ایک دن مجھے اس کے قواعد وضوابط انھوں نے سکھائے۔ میں نے دوسرے دن سات معمے کہے اور انھیں دکھائے، حیران ہوئے اور بہت تعریف کی کیونکہ میں نے پہلی بار ہی یہ کہے تھے۔ ان معموں میں سے تین معمے یہ ہیں:

باسمِ (معنی)

چہ تیرے از سر مستیٔ زدی بر استخوانِ من   کہ ہر دم لذّت مستی دہد در چشم و جانِ من

(فیل وشتر)

فرزین چون سوے مہرۂ پیدل، زچشمِ او   کار تو در خلا و ملا خود تباہ شود

(باسم غلامی)

فتاد زلف بران چہرہ چون زمل بشگفت   ہزار مہ بسرِ سروِ او چوگل بشگفت

شیخ عبدالغفور سنبھلی کے ذکر میں بھی کئی اشعار نقل کیے ہیں جس میں یہ شعر بھی خوب ہے:

نمی خواہد کمال از یار جز یار   بیاموزند درویشاں گدائی

”یعنی بھیک مانگنے کا سلیقہ تو بس اولیاء اللہ ہی سکھاتے ہیں، کمال دوست سے دوست کے سوا کچھ بھی نہیں چاہتا“۔

جیسا کہ راقم السطور نے عرض کیا ہے کہ سید محمد کمال ایک خدا رسیدہ اور صاحب دل صوفی تھے ساتھ ہی وہ ایک صاحب طرز ادیب وشاعر بھی تھے۔ ان ہی کے ایک واقعہ سے ان کی حق گوئی، ذہانت وعقل مندی اور نظم گوئی میں ان کی قدرت کلام کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مشفی سنبھلی کے ذکر میں ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے اپنی ایک مکمل نظم بھی نقل کی ہے وہ واقعہ مع نظم اور ترجمہ کے پیش ہے:

شیخ سعدی قدس سرہٗ نے گلستاں میں فرمایا ہے ”دروغ مصلحت آمیز بہہ از راستیٔ فتنہ انگیز“ اس موقع پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ اب سے چند سال قبل

میں سپہ سالار رستم خان دکھنی کے لشکر میں لشکری تھا اور شیخ نجم الدین لونی ایک دوسرے امیر لشکر کے ماتحت لشکری تھے۔ ان دونوں امیروں میں ایک پُل کے بارے میں خرخشہ چل رہا تھا۔ ہم دونوں کی، ان دونوں کے وکیل کی حیثیت سے دہلی کے حاکم کے پاس آمدورفت رہتی تھی کیونکہ حق میری جانب تھا اس لیے میں اُن سے رجوع حق کی درخواست کرتا تھا۔ مگر وہ منکر ہو جاتے اور مجھے جھوٹا بناتے۔ ایک دن میں ان کے گھر پہنچا اور تنہائی میں ان سے کہا اے شیخ میں آپ کو دیندار اور نیک کردار جانتا ہوں خدا کے واسطے حق بات بتائیں کہ میرے اور آپ کے درمیان حق کس کی جانب ہے، کہا تیری جانب۔ میں نے کہا تو حاکم کے سامنے کیوں اس کا اقرار نہیں کرتے اور کیوں مجھے جھوٹا بناتے ہیں۔ کہا میرے آقا نے مجھ سے ایک کام کے لیے کہا ہے کہ کر، بس وہ کام کرتا ہوں اور چاہے ٹھیک ہو یا غلط، سچ ہو یا جھوٹ۔ میں ان کی اس بات سے بہت محظوظ ہوا۔ اسی معنیٰ میں خود اپنی حکایت یاد آئی کہ اپنی جوانی کے دِنوں کے ایک ماجرے کو میں نے دوسرے کے نام سے نظم کیا تھا۔ اس طویل منظوم حکایت کا ترجمہ ملاحظہ ہو: (۱۵)

''یعنی ایک راہ حق کا سالک نوجوان تھا۔ فکر و تدبر میں بوڑھا (تجربہ کار) اور عشق میں جوان۔ ناگہاں ایک روز ایک خوبصورت مست عورت اس نوجوان کے سامنے گئی اور بیٹھ گئی۔ ایک دوسرے کے روبرو دونوں کی آنکھیں ملیں لامحالہ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کی محبت پیدا ہوگئی۔ عورت کے دل سے عشق کے شعلے بھڑکنے لگے بھلا مشک ختن کی بو کیسے چھپی رہ سکتی ہے۔ اس کے باطن میں عشق کے زخم ہوگئے۔ اس کی جان کے خرمن میں انگارے آپڑے۔ اگرچہ عشق نے اس کے دل میں گھر کر رکھا تھا بظاہر وہ بے نیاز عشق ہو کر رہتی تھی۔ محبوب دل میں تھا مگر باہر سے بے پروا بنتی۔ اندر سے باغ و بہار تھی۔ مگر باہر سے خار خار اور داغ داغ تھی۔ القصہ وہ نوجوان بھی اس معشوقہ کے سامنے اپنے کاروبار سلوک حق میں حیران کار ہو کر رہ گیا۔ اگرچہ وہ عورت ذات سے ہندو تھی لیکن مسلمان ہوگئی۔ اے کمال کفر و اسلام ددنوں مل گئے۔ دونوں حال وقال میں یکساں

ہو گئے۔جیسے جام میں دودھ وشکر یکجا ہو جاتے ہیں اب دیکھنے میں دونوں ایک ہو گئے اگرچہ نام دونوں کے الگ الگ تھے۔دہکتے ہوئے سرے والی لکڑی کو گھما کر دیکھو وہم میں دائرے سے نظر آتے ہیں۔اسی طرح کثرت میں وحدت کا دیدار کرلو کیونکہ بلاشک کثرت عین وحدت ہے۔میں پھر اس داستان کی جانب رجوع کرتا ہوں۔اس عورت نے اس نوجوان کو اشارہ کیا کہ اے نوجوان میرے چہرے کی جانب نظر کر میرے کوچے سے دامن بچا کر نہ نکل میری ذات برادری دیکھ میں کون تو کون عشق کیا چیز ہے؟ اپنی قسم دی اور کہا جا میرے وصل کی تدبیر کر۔سبحان اللہ بات کہاں سے پیدا ہوئی ہے۔اگرچہ بظاہر یہ عشق مجازی کی داستان ہے ورنہ حقیقت میں راز وحدت کا بیان ہے جیسے کے زرگروں کے محلے میں ہتھوڑوں کی آواز سے جنگ کا سماں رہتا ہے ورنہ حقیقت میں تو سونے کے زیور تیار ہوتے ہیں۔حضرت یوسفؑ جیسے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا کیا۔انھیں درد دے کر پھر ان کی یاوری فرمائی یہ بات ہے کہ ہر شے کا عین وہی ہے ایک خدائی سر اور راز ہے۔تو عین کو حاصل کر اور شین یعنی ماسوا سے فارغ ہو جا میں نے وہ برملا کہہ دی جو بات نادر تھی۔چھلکا چھوڑ اور مغز (گری) کو لے لے بلکہ چھلکا اور گری دونوں کو چھوڑ دے تاکہ غیر دوست سب کچھ ہیچ ہو جائے۔اے کمال تیرے کرنے کا کام بس یہی ہے کہ یہی کہے یہی جانے یہی دیکھے''۔

سید محمد کمال فارسی اور ہندی کے قادرالکلام شاعر تھے بلکہ ان کے ایک معاصر مؤرخ خواجہ محمد یعقوب نے تو انھیں فارسی سے زیادہ اچھا اور بہتر ہندی کا شاعر بتایا ہے،خود سید محمد کمال کی زبانی سنیے،جو آپ نے مشفی سنبھلی کے ذکر میں لکھا ہے۔

''خواجہ محمد یعقوب جو میرے شیخ کے ماموں خواجہ محمد صادق کے صاحبزادے ہیں بڑے سمجھدار اور سنجیدہ جوان ہیں۔انھوں نے اپنے چشم دید فقرا کی تاریخ لکھی ہے۔اس تاریخ میں مجھ عاجز کو بھی شامل کیا ہے۔میرے بارے میں بھی لکھا ہے کہ اس کے ہندی شعر فارسی اشعار سے زیادہ اچھے ہیں۔جیسا کہ فضلائے وقت نے مشفی سنبھلی مرحوم کے بارے میں یہی کہا ہے۔میں نے ان کے دونوں کلاموں

کا نمونہ دکھا دیا۔ نمونہ کے طور پر دوہرہ کا یہ ہندوی شعر پیش ہے: (۱۶)

دوہرہ

دوئی لکھوں تو دوی نہ وہی کہوں بھئی (کمال) دوی　　اوہیں کہوں تو ایک ہی کہوں جو ہوئی سو ہوئی

اپنے پیر و مرشد کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میرے شیخ ''نور وحدت'' میں فرماتے ہیں کہ درویشی تصحیح خیال کا نام ہے۔ کیونکہ غیر کے خیال کے سوا کوئی پردہ نہیں۔ پردے کا اٹھانا بھی خیال سے ہی کرنا چاہیے۔ دن رات خیال وحدت میں رہنا چاہیے۔ میں نے ایک موقع پر اس دقیقے پر مشتمل ہندی میں ایک شعر کہا ہے:

جو توہ لاگے پریم دکھ کرا پاؤ نہ لاگ　　جیوں لوہو کون سوہی اک جری کوں آگ

''یعنی جب تجھے آزار محبت ہو جائے گا تو کسی غیر سے کوئی لگاؤ نہ رہے گا۔ ایک کے خیال میں سارے خیالوں میں آگ لگ جائے گی''۔

شیخ محمد امین الدین لاہوری اور شیخ رزق اللہ کے ہندی اشعار پیش کرنے کے بعد سید کمال نے اپنے خاصے اشعار نقل کیے ہیں، طوالت کی وجہ سے یہاں ان کو ترک کیا جاتا ہے۔

شیخ احمد سنامی کے ذکر میں حضرت مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے عم بزرگوار حضرت شیخ رزق اللہ ابن شیخ سعد اللہ مؤلف ''تاریخ مشتاقی'' جو شاعر بھی تھے، فارسی میں ''مشتاقی'' اور ہندی میں ''راجن'' تخلص کرتے تھے۔ ان کے ہندی کلام کا نمونہ پیش کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

''یہ چند شعر اپنی کتاب ''پیم اپاون'' سے پیش کرتا ہوں۔ سید محمد کمال کے ہندی اشعار:

شیخ آدم سنبھلی جو ایک بغیر پڑھے لکھے مگر صاحب دل اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ تصوف کے رموز کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور ان پر عمل پیرا تھے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے سید محمد کمال نے اپنی ہندی تصنیف ''پیم چرت'' کے اشعار نقل کیے ہیں۔

ایک بار میں ہندی رسالہ ''پیم چرت'' جو کہ تصوف کے مباحثۂ عقل و عشق پر مشتمل ہے شیخ آدم کے پاس لے گیا اور ان کے سامنے پڑھنا شروع کیا۔ انھوں نے ذوق کے ساتھ سننا شروع کیا اسی دوران وہ مراقب ہو گئے تو میں نے پڑھنا بند کر دیا انھوں نے سر اوپر اٹھا کر کہا پڑھو میں ان معارف میں محو ہو گیا

ہوں یہ ایک نیکی کی بات ہے جسے آخر تک سننا چاہیے اور پوری کتاب سنی۔ یہ چند شعر اسی کے ہیں: (۱۷)

کثرت وحدت ہوت ہے پہنچن وحدت ذات بند جو پڑی سمند میں سو سمند ہوئی جات

احمد سدا پار ہے جو ذات کی نات تا میں لہریں پیم کی نسِ دن آوت جات

''یعنی کثرت وحدت میں مل کر وحدت ہوجاتی ہے۔ جو بوند سمندر میں گر جائے وہ بھی سمندر ہی بن جاتی ہے''۔

ان کے علاوہ سورٹھ اور دوہرہ میں بھی ان کے اشعار ہیں۔

میر عماد کے فرزند میر مفاخر حسین جو اپنے دور کے فارسی شعراء میں خاصے نامور ہوئے، ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک دن وہ میرے شیخ کے پاس آئے اور ہندی اشعار کا ذکر چھیڑا اور اپنے چند شعر سنائے میرے شیخ نے مجھے اشارہ کیا کہ اپنا ہندی کا سویہ سناؤں۔ شیخ نے میرا وہ ''پرمارتھ'' نام کا سویہ جو میں نے کہا تھا، سن کر پسند بھی فرمایا اور اپنی یادداشت (بیاض) میں لکھوا بھی لیا تھا۔ میں نے پڑھا:

لکھ لکھ پوتھی کیا بانچت لوکن مانہہ بات سن سانجھ بری پوتھی سبھی

پھاردار کی لے مانجھ دھاردار بدھا ہوسیار وار پارہم آنچ وے

آنکھیں کوں تور دارسن کوں نجوردا مسوانی تیوردار جہادسات پانچ وے

وہ بہت ہی محظوظ ہوئے۔ ایک بار اور بھی شیخ کی خانقاہ میں ان ہندی اشعار کی مجلس رہی میں نے اپنے رسالہ ''پیم چرت''، ''پیم اشیک''، ''پیم ابن'' انھیں پڑھ کر سنائے بہت ہی مسرور ہوئے''۔

سید محمد کمال نے شیخ مصطفی بن ابراہیم کے بارے میں لکھا ہے کہ ''کبھی کبھی وہ ہندی اور فارسی اشعار بھی کہا کرتے تھے۔ ایک بار کسی مشہور شاعر کا یہ مطلع سنبھل میں پڑھا گیا۔''

تا دست تیغِ آن بت مغرور شد بلند صد گردن نظارگی از رشک شد بلند

''یعنی جیسے ہی اس بت مغرور نے ہاتھ میں تلوار لی کہ کسی کو قتل کرے تو رشک سے سو گردنیں

اُٹھیں کہ دیکھیں وہ کون خوش نصیب ہے''۔

تو انھوں نے کہا:

شد پیش گاہِ موکب عشاق را علَم ۔۔۔ آن چوب خشک رایت منصور شد بلند
زاہد لباس غرہ مبَر شملہ ات مدام ۔۔۔ بر روے پشت چون دُم لنگور شد بلند

''یعنی عاشقوں کی سپاہ کے سامنے دار منصور کی خشک لکڑی کا نشانِ بلند قائم ہو چکا کہ عشق میں یوں جاں دی جاتی ہے۔اے زاہد لباس زاہدانہ پر ناز نہ کر۔ ہر وقت تیری کمر پر صافے کا لٹکا ہوا شملہ لنگور کی دم کی طرح بلند ہوتا ہے''۔

ان اشعار کو نقل کرنے کے بعد انھوں نے ہندی کنڈلیا کے ایک مصرعہ پر پانچ مصرعے کہے:

سید محمد کمال نے اپنے دور کے ایک فارسی اور ہندی کے قادرالکلام شاعر ملا ظاہری پانی پتی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس وقت کے دانشمند اور خوش مزاج لوگوں میں سے ایک مُلّا ظاہری پانی پتی بھی ہیں۔فہیم و خوش کلام مقبول و مطبوع اغنیا فارسی اور ہندی میں شعر کہتے ہیں۔ ان کا ہندی کا کلام فارسی کلام سے اچھا ہے۔ ہندی کلام میں وہ ''اشلیکہ'' زیادہ کہتے ہیں۔ اشلیکہ اسے کہتے ہیں کہ ایک لفظ دو معنی میں آتا ہے اور وہ لفظ شعر کا قافیہ ہوتا ہے جیسے کہ ''نزہت الارواح'' کے یہ دو شعر ہیں:

کمالِ عاشقی پروانہ دارد ۔۔۔ کہ غیر از سوختن پروانہ دارد
گر دیو مسخر تو گردد ۔۔۔ زین ہر دو چہ حاصل تو گردد

''یعنی عاشقی میں کمال تو پروانہ رکھتا ہے کہ علاوہ جلنے کے اسے کوئی پروا نہیں رہتی۔ اگر دیو پری تیرے مطیع اور تابعدار بھی ہو جائیں۔ ان دونوں سے تجھے کیا حاصل ہو جائے گا''۔

ملا ظاہری کا ہندی شعر ہے:

نا ندا لاد چلا بنجارا ۔۔۔ اگ لگائی سی بن جارا
باکسیں سریں پھول نہ ہیرا ۔۔۔ جو جا باسو مہکا جیرا

اس کے بعد لکھتے ہیں:

''اس وقت مجھے یہ طرز کلام بہت اچھا لگا تھا میں نے مکمل ایک رسالہ ہندی ''اشلیکہ'' طرز پر لکھا تھا جس کا نام ''پیم اشلیکہ'' ہے جو کہ سلوک کے مراتب عشرہ، جذبہ اور توحید پر مشتمل تھا جب میں نے اپنے شیخ کو سنایا تو بہت پسند کیا''۔(۱۸)

بیربل، شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے مشہور نو رتنوں میں سے ایک تھے۔ جو اکبر بادشاہ کے خاص لوگوں میں اور اس کے مزاج شناسوں میں نہایت فہیم وظریف تھے۔ سید محمد کمال نے کئی جگہ ان کی تعریف وتوصیف کی ہے۔ بیربل عہد اکبری کے مشہور بزرگ حضرت شیخ چائلدہ سنگی قدس سرہٗ سے بہت زیادہ محبت عقیدت رکھتے اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور راہِ درویشی کی بڑی صاف ستھری گفتگو کرتے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ایک بار شیخ چائلدہ سنگی قدس سرہٗ نے بطور لطف ومہربانی پان کا بیڑہ اس کو دے کر کہا اللہ تعالیٰ تجھے دونوں آگوں سے نجات دے۔''

شیخ نظیر علی سنبھلی کے ذکر میں بیربل کا ایک بے نظیر واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ کمال سنبھلی کی ہی زبانی سنیے:

''شیخ نظیر علی ہی نے فرمایا: بیربل سخاوت میں درجۂ کمال رکھتا تھا۔ اس کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار ہندستان کے راجاؤں میں سے ایک نامدار بادشاہ نے ایک بادفروش (مسخرے) کو اس کا امتحان لینے کے لیے بھیجا۔ وہ شہر میں یہ آواز لگاتا پھرتا کہ ہے کوئی جو سو روپئے ایک ہاتھ میں لے اور جوتا دوسرے ہاتھ میں لے۔ میں وہ سو روپے اس سے لوں اور اس کے ننگے سر پر سو جوتے ماروں۔ اس آواز کو (بیربل) نے دوبار سُنا لاپرواہی کی مگر جب تیسری بار سُنا تو خود سے کہا کیوں اسے پریشان کروں۔ کیونکہ اس کام کو میرے سوا دوسرا کوئی اپنے ذمے نہ لے گا۔ آخر سو روپئے اور جوتا دونوں ہاتھوں میں لے کر سر ننگا کر کے لوگوں کے سامنے ہی کھڑا ہو گیا اور اس مسخرے سے مسکرا کر کہا۔ اپنا کام کر۔ مسخرے نے سو روپے لیے گن کر گرہ میں باندھے اور کہا سر نیچا کر، جوتا اُٹھایا کہ مارے، بیربل کو دیکھا کہ اس میں کوئی تغیر نہ ہوا۔ روپیہ پھینکا اور اس کے پیروں میں گر گیا اور کہا کہ فلاں راجہ نے تیرے امتحان کے لیے مجھے بھیجا تھا واقعی تو ویسا ہی ہے جیسا سُنا تھا۔ وہ ہی فرماتے ہیں کہ ایک دن بادشاہ موتی اور جواہرات سے سجا ہوا ایک گلدستہ نہایت نفیس اور پر تکلف ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا اور عظیم الشان امرا دائیں بائیں کھڑے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے معلوم کیا یہ گل دستہ کس کو دوں۔ کوئی کچھ نہ بولا تو بیربل نے کہا بادشاہ دل کی

طرف دیکھیں جس کو دل کہے اُسے دے دیں۔ بادشاہ نے اشارہ سمجھ لیا اور اُسے ہی دے دیا کیوں کہ وہ بائیں جانب کھڑا تھا۔ اس کے ہندی کے بہت سے اشعار مشہور و معروف ہیں۔ بہت سے اچھا مضمون رکھتے ہیں۔ ان میں سے اس کا یہ شعر اگر چہ اس کے زبوں اشعار میں سے ہے مگر مجھے پسند ہے''۔

چھاڈو یہ دنیا چھچھوری چھنار ہے — او کو نہ پکارو اَن کا ہے نہ کار ہے

یہ اور ہو کی بکری سو تو ہوں کو بیکار ہے — کاہو کوا نگ لگاوے کاہو کو من مسار ہے

کاہونک جھک لاوے، کیل کی کلار ہے — اُر نہ چڑھاؤ نہ بڑھاؤ، نہ لڑاؤ نک

میں نے بھی اس کے تتبع میں سو یہ کہا تھا: (۱۹)

دنیا اچھوتی نار ہی یا سنسار ہے — جو ہونر سوردتن جاوے نہ بولن آوے

واکے نار، واکو نہ بھتار ہے — جو ہو جن پیچ داسون آنچہ کی لوار ہے

بھوگے مار تاہی یہ سنہا رہے — کاہو کو نہ لیجئے اور نہ ریاس کیجیے

ورہوی بیا کیسے بھیس اس آیت اتار ہے — نر نرہے بچار پیچ، پیچ رنجہ پتوار ہے

یہ تھا سید محمد کمال کے دستیاب کلام کا مع ترجمہ مختصر سا تعارف۔ کلام کے ماخذ کے طور پر ہمارے پاس صرف اور صرف ''اسراریہ کشف صوفیہ'' ہی دستیاب ہے جبکہ ان کی نظم گوئی یعنی ہندی اور فارسی شاعری میں اور بھی کئی تصانیف ہے مگر ابھی تک وہ پردہ اسرار میں ہیں لیکن دستیاب ''مشتِ نمونہ از خروارے'' سے یہ تو بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ سید محمد کمال ایک قادرالکلام اور ذہین، زود گو شاعر ہیں۔ بالخصوص تاریخ گوئی کے میدان میں انھیں ایک خاص ملکہ و مہارت ہے۔ دیگر تصانیف کے سلسلے میں راقم الحروف کی تلاش مستقل جاری ہے۔

حواشی

(۱) اسراریہ کشف صوفیہ، اردو ترجمہ، ص ۶۲۔ (۲) ایضاً، ص ۹۷۔ (۳) ایضاً، ص ۱۸۸-۱۸۹۔ (۴) ایضاً، ص ۲۳۴۔ (۵) ایضاً، ص ۳۳۰۔ (۶) ایضاً، ص ۳۳۴۔ (۷) ایضاً، ص ۳۳۴۔ (۸) ایضاً، ص ۴۳۹، (۹) ایضاً، ص ۴۴۹۔ (۱۰) ایضاً، ص ۴۹۱۔ (۱۱) ایضاً، ص ۶۰۰۔ (۱۲) حاشیہ: پیش، تاریخ سنبھل یعنی مصباح التواریخ، ص ۲۰، مؤلفہ مولانا عبدالمعید صاحب سنبھلی۔ (۱۳) اسراریہ کشف صوفیہ، اردو ترجمہ ۱۰۹۔ (۱۴) ایضاً، ص ۵۷۱۔ (۱۵) ایضاً، ص ۶۱۵۔ (۱۶) ایضاً، ص ۶۲۲۔ (۱۷) ایضاً، ص ۳۰۶۔ (۱۸) ایضاً، ص ۶۴۸۔ (۱۹) ایضاً، ص ۵۱۵۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں

ڈاکٹر حسن بیگ

(۲)

آل انڈیا ویدک اور یونانی کانفرنس: کراچی، ۲۱ فروری ۱۹۲۱ء کے صدارتی خطبے میں حکیم صاحب نے ویدک اور طب کی مختصر تاریخ بیان کی اور مختلف اصطلاحات کے ناموں کی مثالیں دے کر سمجھایا کہ طب مشرقی ہو کہ مغربی سب قدیم یونان سے شروع ہوتی ہیں۔ مغرب کے کشادہ دل اور انصاف پسند ماہرین کے قول دہرائے جنھوں نے بغیر کسی تنگ دلی کے اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں اور دیسی طبوں کے قابل قدر ہونے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ دیسی طبوں کی حمایت میں فرمایا یہ اپنی اور ملکی ہیں، قدیم ہیں، اسّی سے نوے فیصد آبادی ان سے فائدہ اٹھاتی ہے، اس میں مفید علاج پائے جاتے ہیں، ان میں بے شمار جڑی بوٹیاں ہیں جو یہاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے یہ علاج سستے ہیں، حالات جنگ میں غیر ملکی دواؤں کی قلت ہو سکتی ہے لیکن ملکی دواؤں کی نہیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے حکومت اور اطبا سے درخواست کی کہ دیسی طبوں کے اسکول اور کالج کھولے جائیں، دیسی دواؤں کو زمانے کی ضرورتوں اور مذاق کے موافق بہتر صورت میں پیش کیا جائے، اطبا اپنے آپ کو منظم کریں، انجمنیں قائم کریں، تبادلہ خیالات کریں اور جڑی بوٹیوں پر تحقیق کریں اور عوام کو ان کے فوائد سے مطلع کریں۔ حکومت سے یہ بھی خواہش کی کہ طب یونانی اور آیورویدک ایکٹ پورے ہندوستان کے لیے بنایا جائے۔ قابل دیسی اطبا کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ مرکزی حکومت صوبائی حکومتوں سے کہے کہ اپنے میڈیکل رجسٹریشن ایکٹوں میں ترمیم کریں۔ جن دیسی ماہرین نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہو ان کو رجسٹر کیا جائے اور دیسی طب کی درسگاہوں کو تسلیم کیا جائے، طبی سرٹیفکٹوں کو قبول کیا جائے۔ جس طرح یو پی گورنمنٹ نے اپنے ایکٹ میں

ترمیم کی ہے باقی صوبے بھی اپنے ایکٹوں میں ترمیم واضافے کریں۔(۴۴)

جامعہ ملیہ(۴۵)اول جلسہ تقسیم اسناد: دسمبر ۱۹۲۱ء کے صدارتی خطبے میں جامعہ ملیہ کے بنیادی مقاصد بتاتے ہوئے فرمایا کہ اس کا مقصد ایسے مسلمان پیدا کرنا ہے جو اپنے مذہب سے نہ صرف واقف ہوں بلکہ اس پر سختی سے عمل پیرا بھی ہوں، وہ جدید علوم سے ضرور واقف ہوں لیکن اسلامی زندگی کا نمونہ ہوں اور ایک خود دار مسلمان کی طرح زندگی بسر کریں۔اس لیے تاریخ اسلامی کو تعلیم کا ایک جز قرار دے دیا گیا ہے،غیر ملکی زبان کے ذریعے تعلیم دینے کے غیر فطری طریقے کا بیک قلم سد باب کر دیا گیا۔ ہندو طلبہ کے لیے اسلامی اور اسلامی طلبہ کے لیے ہندو تہذیب کی معلومات حاصل کرنا بھی شامل کورس کیا گیا ہے۔کسب معاش کے لیے آدمی مسلمان رہ کر ملت اسلامی کے ایک حساس اور فرض شناس رکن کی حیثیت سے بھی محنت کر سکتا ہے۔اساتذہ سے فرمایا کہ ان کو طلبہ کے سامنے اپنی زندگی کا عملی نمونہ پیش کرنا ہوگا،طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تم کو پامردگی اور بلند حوصلگی سے کام لینا ہوگا، میں ان تکالیف سے واقف ہوں جو تمہیں اٹھانی پڑی ہیں، اگر تم اپنے اعلیٰ مقصد اور ارادوں پر قائم رہے تو تمام مشکلیں سہل ہو جائیں گی۔(۴۶)

کانگریس کے سالانہ جلسہ احمد آباد ۱۹۲۱ء میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ سی آر داس کی قربانی سے ہم اپنے نصب العین کے قریب آ گئے ہیں،عدم تعاون کی روح تمام ملک پر طاری ہے، ہم سوراج حاصل کرنے اور حکومتی دست درازیوں پر ہنسی خوشی مصائب جھیلنے کے جذبے سے لبریز ہیں۔حکومت کے بے پناہ جبر کے باوجود کہیں بھی جواب میں تشدد نہیں کیا گیا۔لوگوں میں قومی جدوجہد کو جاری رکھنے اور مطالبات پر ڈٹے رہنے کا عزم اور بھی پختہ ہو گیا ہے۔اس زمانے میں پرنس آف ویلز کے ہندوستان کے دورے کا اعلان ہو چکا تھا،اس پر فرمایا کہ ہمیں اُن سے کوئی ذاتی عداوت نہیں، ہم یہ نہیں چاہتے کہ ایک دیوالیہ حکومت کو اپنا کھویا ہوا وقار پھر حاصل کرنے کا موقعہ مل جائے، اس لیے ہم ان کا خیر مقدم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔موپلے بھائیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا اور ہندو بھائیوں پر جو ظلم ہوئے ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ اکّادکّا واقعات بے راہ روافراد کے اقدامات ہیں جن کی ہم مذمت کرتے ہیں۔(۴۶)

حکیم صاحب کی صحافت ان کی سیاسی زندگی کے شروع سالوں میں رہی،اکمل الاخبار ۱۸۶۶ء

میں جاری ہوا تھا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ اس کے مالکوں میں حکیم غلام رضا خاں (حکیم صاحب کے چچازاد بھائی) شامل تھے، حکیم اجمل خاں کے مضامین بھی اس میں شامل ہوتے تھے، اس کے لیے اکمل المطابع ایک چھاپہ خانہ بھی شروع کیا گیا تھا، اسی چھاپہ خانہ میں غالب کے خطوط کا مجموعہ ''اردوے معلیٰ'' شایع ہوا تھا جس کے آخری صفحے پر غالب نے اس کے حقوق اشاعت حکیم غلام رضا خاں کو سونپ دیے تھے۔(۴۸) ''مجلہ طبیہ'' حکیم واصل خان کی سرپرستی اور حکیم اجمل خاں کی نگرانی میں ۱۹۰۳ء سے جاری ہوا، اس میں مدرسہ طبیہ کی خبریں، عام دلچسپی کے مضامین، گوشہ الادویہ، امراض سے بحث اور متفرق مضامین ہوتے تھے۔ اس کی آخری اشاعت اکتوبر ۱۹۱۸ء تک معلوم ہے۔(۴۹) ایک اور رسالہ ''طبیب'' حکیم اجمل خاں نے ملا واحدی کی ادارت میں نکالا تھا، یہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۳ء تک نکلا، یہ مجلہ آل انڈیا یونانی اینڈ ویدک طبّی کانفرنس کا ترجمان تھا۔ ملا واحدی نے لکھا ہے کہ حکیم صاحب سے میرا روز کا واسطہ تھا میں نے حکیم صاحب سے زندگی کو برتنا سیکھا، حکیم صاحب نے میری تربیت فرمائی۔(۵۰)

تحقیق: حکیم صاحب کو طب میں تحقیق، طبی کتب کی اصلاح، اردو میں ہونے کا انتہائی جنون تھا۔ ان کی نظر میں طب کی مروجہ کتابیں بہت سے جدید مسائل سے عاری تھیں، اس لیے ضرورت ہے کہ اُن کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے، جو فرسودہ باتیں ہیں ان کو خارج کیا جائے اور جدید تحقیق کو شامل کرکے ایک نیا نصاب ترتیب دیا جائے اور ایک کتاب جس کا نام انہوں نے ''قانون عصری'' تجویز کیا تھا اس پر انہوں نے اور دوسرے طبیبوں نے کام کیا اور اس کا پہلا حصہ شائع بھی ہوا لیکن ان کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔(۵۱)

حکیم صاحب نے اپنے آخری دورہ یورپ ۱۹۲۵ء میں جرمنی میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کو جڑی بوٹیوں کی جدید تحقیق کے لیے چنا تھا۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی جرمنی میں سخت معاشی مشکلات کا زمانہ تھا، ان کی تعلیم کو مکمل کرنے کے لیے حکیم صاحب چار سو روپے ماہوار بھیجا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صدیقی حکیم صاحب کے آخری سالوں میں ہندوستان واپس آئے اور طبیہ کالج میں تحقیق کا شعبہ شروع کیا۔ حکیم صاحب کی تجویز پر انہوں نے ''پگلے کی بوٹی'' (راؤولفیا سرپن ٹائی نا) نامی پودے کی جڑ پر اپنی تحقیقات شروع کیں اور اس میں سے نو الکلائند دریافت کیے، جس میں مشہور و معروف

نام انہوں نے حکیم اجمل صاحب کے نام پر رکھے، اجملین، اجملا سین، آئی سو اجملین، نیو اجملین۔ یہ دوائیں بلڈ پریشر، دل کے امراض، اختلاج قلب اور دماغی امراض کے لیے مفید ہیں اور آج بھی ان کا استعمال ہوتا ہے۔(۵۲، ۵۳)

انتقال: حکیم صاحب کا انتقال رام پور میں ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون، یہ ان کے پرانے مرض انجائینا کی وجہ سے ہوا، جس کا پہلا دورہ ۱۹۰۴ء میں ہوا تھا، یہ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کی تاریخ تھی، نماز جنازہ رامپور اور جامع مسجد دلّی میں ہوئی، دلّی جامع مسجد میں ایک جم غفیر جمع تھا، تدفین خاندانی قبرستان پنچ کوئیاں روڈ، دلی میں ہوئی۔ کانگریس کے اجلاس مدراس کے وقت یہ خبر پہنچی، پورا ماحول سوگوار ہو گیا۔ دوسرے روز کے اخبار دی ٹائمز لندن میں انتقال کی خبر اور زندگی کے حالات شائع ہوئے۔(۵۴) پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح میں لکھا: وہ کانگریس کے بزرگ راہ نما اور صدر ہونے کے علاوہ بھی ایک بے نظیر شخصیت تھے............وہ دلی کی قدیم معاشرت کا نمونہ تھے، ان کے انداز و اطوار شاہانہ اور گفتگو میں نرمی تھی۔ وہ طبیبوں کے ایک مشہور گھرانے کے چشم و چراغ تھے جن کی حکمت کو قبول عام حاصل تھا،...... جنگ عظیم، پنجاب مارشل لا اور خلافت کے دوران وہ عدم تعاون میں شریک تھے، ہندو اور مسلمانوں کو بہت قریب لے آئے تھے، گاندھی جی کے قابل اعتماد دوست جن پر گاندھی جی ہندو مسلم تعلقات اور مشوروں پر مکمل یقین رکھتے تھے۔ میرے والد اور حکیم جی ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔(۵۵)

حسب نسب: حکیم صاحب کے سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں کہ آپ کا سلسلہ نسب خواجہ عبید اللہ احرار سے ملتا ہے۔ خواجہ نقشبندی سلسلے کے ایک مشہور و معروف صوفی ہیں، جن کا تعلق ظہیر الدین بابر کے دادا ابوسعید مرزا سے تھا جن کے کہنے پر ہی خواجہ تاشقند چھوڑ کر سمرقند میں آ بسے تھے، بابر کے چچا سلطان حسن مرزا بھی ان کے معتقد تھے اور بابر کے والد عمر شیخ مرزا کو خواجہ نے اپنا بیٹا بنایا تھا، بابر کا نام ظہیر الدین بھی خواجہ ہی نے رکھا تھا۔(۵۶) آپ کا انتقال ۱۴۹۰ء میں ہوا۔ ان کے دو صاحبزادے تھے، حکیم صاحب کا سلسلہ بڑے بیٹے خواجہ عبداللہ (خواجکا) سے ہے، انہوں نے تین شادیاں کیں جن سے سات بیٹے تھے۔(۵۷) سب سے چھوٹے بیٹے خواجہ یوسف جن کی ماں ترک تھیں، ان سے حکیم صاحب کا نسب ہے۔ خواجہ یوسف کے متعلق

سوانح نگاروں نے زیادہ نہیں لکھا، اس پر تاریخی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ مرزا حیدر دوغلت ظہیرالدین بابر کے خالہ زاد بھائی اور ''تاریخ رشیدی'' کے مصنف ہیں، انہوں نے اس کتاب میں خواجہ یوسف کے حالات تحریر کیے ہیں۔ خواجہ یوسف کاشغر میں آباد ہو گئے تھے۔ کاشغر مشرقی ترکستان میں تاشقند سے آٹھ سو میل جانب مشرق واقع ہے، وہاں کے حکمراں سلطان سعید خاں نے ان سے عقیدت کا اظہار کیا اور مرزا حیدر نے خواجہ کا بار بار ذکر کیا ہے۔ (۵۸) خواجہ یوسف ایک مختصر بیماری کے بعد کاشغر میں ہی انتقال فرما گئے تھے، مرزا حیدر نے ان کی تاریخ وفات (۱۴؍صفر ۹۳۷ھ/ ۷ اکتوبر ۱۵۳۰ء) ''طائر بہشتی'' سے نکالی (۵۹)، یعنی ان کا انتقال ظہیرالدین بابر کے انتقال (۶ جمادی الاول ۹۳۷ھ/ ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء) سے دو مہینے اور انیس دن پہلے ہوا، اس طرح یہ کہنا کہ حکیم صاحب کے اجداد بابر کے ساتھ آئے تھے ثابت نہیں ہوتا۔ (۶۰) یقیناً خواجہ یوسف کی اولاد میں سے کوئی بابر کے بعد ہندوستان میں مستقل آباد ہوا ہوگا۔ خواجہ یوسف اپنے آخری وقت میں اپنے گھرانے کو مرزا حیدر کی سپردگی میں دے گئے تھے، چنانچہ مرزا حیدر لکھتے ہیں کہ انہوں نے مجھے بلایا، ''ایک جامہ جس کا استر نیلا تھا، ایک مفلر دیا اور اپنے متعلقات کو میرے سپرد کیا''۔ (۶۱) مرزا حیدر نے اس کے بعد کشمیر فتح کیا تھا اور پھر ہمایوں کے زمانے میں ہندوستان وارد ہوئے، اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ خواجہ محمد یوسف کی اولاد ان کے ساتھ ہندوستان آئی ہو۔ خواجہ یوسف کے بعد کی کئی پیڑھیوں کے حالات ابھی تک تاریخی طور پر دریافت نہیں ہوئے۔ خواجہ یوسف کی چھ نسلوں بعد ملا علی قاری اور ملا علی داؤد کا سوانح نگاروں نے ذکر کیا ہے لیکن حکیم محمود خاں نے اپنی ہاتھ کی لکھی ہوئی بیاض ''قوانین حکمت شریفی میں لکھا ہے کہ ''اجداد کے حالات پر خاندانی سلسلے کی معلومات کے تعلق سے ایک کتاب لکھی گئی تھی جو حکیم شریف خاں کے انتقال کے بعد حکیم محمد اشرف خاں (ابن حکیم شریف خاں) کے حصے میں آئی، وہ ان سے ضائع ہو گئی...... برادر عزیز حکیم غلام مرتضیٰ خاں نے خاندانی حالات پر ''دستخطی خویش'' کے نام سے ایک کتاب تحریر کی ہے'' (۶۲) جس میں پہلی دفعہ ملا علی قاری و ملا علی داؤد کا نام آیا ہے۔

خواجہ یوسف کے بیٹے خواجہ محمد فیروز سے حکیم محمود خاں تک ۱۵؍نسلیں ہوتی ہیں، اس کے مقابلے میں احسن خانی شجرے میں (جن کا شجرۂ نسب بھی احراری ہے) خواجہ محمد فیروز سے

حکیم بدرالدین (پ ۱۸۴۰ء) (۶۳) تک گیارہ نسلیں ہیں، اس طرح شریف خانی شجرے میں دو یا تین نسلوں کا اضافہ بھائیوں کے نام کے ساتھ آجانے کی وجہ سے ہوسکتا ہے۔ ملا علی قاری خواجہ فیروز کی ساتویں نسل میں دکھائے گئے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا زمانہ ۱۷۴۰ء ہوتا ہے (ایک صدی میں تین یا چار نسلیں ہوسکتی ہیں)، لیکن تاریخی ماخذ میں ان کا انتقال ۱۶۰۵ء میں ہو چکا تھا، ملا علی قاری کبھی بھی ہندوستان نہیں آئے۔ (۶۴) اس کے بعد حکیم اکمل خاں اور حکیم شریف خاں کے حالات تفصیل سے ملتے ہیں۔ حکیم شریف خاں عالم، مصنف، مولف اور صاحب کتب تھے جس کی وجہ سے خاندان ان کے نام سے مشہور رہا۔

مسیح الملک (۶۵) کی محفلیں: حکیم صاحب کے دیوان خانے میں شامیں دوستوں اور ملنے والوں کے لیے مخصوص تھیں، جس میں شعر و شاعری، ساز و آواز، ادبی اور تفریحی مشاغل ہوا کرتے تھے۔ اس کا ایک منظر درج ہے:

”سفید براق مکلف فرش ہے، قالینوں کے ساتھ سہارے کے لیے تکیے لگے ہیں۔ دیواروں پر جا بجا مشہور خطاطوں کی وصلیاں اور کتبے آویزاں ہیں۔ دروازوں پر پٹاپٹی کے پردے لٹک رہے ہیں، حکیم صاحب اپنے مخصوص احباب کے درمیان تشریف فرما ہیں۔ ان کے سامنے ایک مناسب مقام پر میر صاحب (باقر علی داستان گو) محفل میں بیٹھ کر داستان سرائی کر رہے ہیں۔ دو تین بیدری کام کے فرشی حقے اور لمبی پیچد ار اسٹک والی کلی کا دور جاری ہے۔ پان کے بیڑوں سے پُر چاندی کا خاصدان، اُس کے قریب ہی اگالدان حکیم صاحب کے پاس موجود ہے“۔

حکیم صاحب اہل فن کے خاموش قدردان اور سرپرست تھے، ان کی داد دہش کا انداز بھی حکیمانہ تھا۔ اُن کے الطاف و اکرام کی صورت یہ تھی کہ میر صاحب جب ضرورت مند ہوتے تو دو چار سیر چھالیا کی ایک پوٹلی لے کر حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کرتے ”حکیم صاحب چھالیا لایا ہوں، اگر پہلی چھالیا ختم ہوگئی ہو اور اس وقت ضرورت ہو تو حاضر ہے“، حکیم صاحب فرماتے ”میر صاحب میں تو کئی دن سے آپ کا منتظر تھا، اچھا ہوا آپ آگئے چھالیا گھر میں بھجوا دیجیے اور دیکھیے اپنی خالی پوٹلی ابھی لیتے جائیے گا“۔ یہ پوٹلی حکیم صاحب کی ہدایت کے مطابق زنان خانے سے بظاہر خالی آتی لیکن دراصل ایک معقول رقم سے اور وہ بھی نوٹوں کی شکل میں پُر ہوتی۔ (۶۶)

ایک اور منظر ملاحظہ کریں:

"(دلی کی) سردی کا موسم، کڑاکے کا جاڑا، رات کا وقت، بارہ ایک کا عمل، بازاروں میں سناٹا، جامع مسجد پر ہلکے ہلکے (ایک) بگھی آئی اور جنوبی دروازے پر ٹھہر گئی۔ حکیم اجمل خاں نکلے سیڑھیوں پر جو سکڑے سکڑائے پڑے تھے گاڑی میں سے لحاف نکالتے اور ہر ایک کو آہستہ سے اڑھا دیتے، جب سب ہی کو اڑھا چکے تو گاڑی ہلکے ہلکے ہرے بھرے صاحبؒ کے مزار کی طرف چلی گئی"۔(۶۷)

حواشی

(۴۳) ایضاً، ص ۱۲۵۔ (۴۴) حکیم اجمل خاں، علی برادران اور نواب وقارالملک علی گڑھ کالج کو ایک ایسی جامعہ بنانا چاہتے تھے جیسے اسلامی دور میں جامعہ قرطبہ تھی، تجویز انگریز حکومت کی پیشکش کے خلاف تھی۔ وہاں سے جو تجاویز آئی تھیں اس میں شرطیں تھیں کہ یونیورسٹی کا نام صرف علی گڑھ یونیورسٹی ہو (اسلامی نہیں)، اس کو دوسرے کالجوں کو الحاق کرنے کی اجازت نہ ہو اور وائسرائے اس کے چانسلر ہوں۔ اس وقت جو اصحاب کالج میں اقتدار پر تھے وہ چاہتے تھے کہ جو پیشکش آئی ہے وہ قبول کر لینی چاہیے۔ عدم تعاون کے زمانے میں صاحب اقتدار اصحاب سے درخواست کی گئی کہ حکومتی امداد لینی بند کر دی جائے، لیکن اس کا کچھ اثر نہیں ہوا، اس کے بعد طلبہ سے درخواست کی گئی، جس پر تقریباً تین سو طلبہ نے علی گڑھ کالج چھوڑ دیا۔ ان کی تعلیم کے لیے جامعہ ملیہ کی بنیاد پڑی۔ اس کا افتتاح شیخ محمود الحسن نے ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو کیا۔ حکیم صاحب اس کے پہلے امیر جامعہ بنائے گئے، (ایضاً، حاشیہ ۱۵، ص ۱۵۲-۱۵۶)، جامعہ کے حالات علی گڑھ میں مالی مشکلات کی وجہ سے اس قدر پریشان کن ہو گئے کہ حکیم صاحب اور دوسرے ارکان اس کو دلی لے آئے کہ قربت کی وجہ سے اس کا انتظام کرنا آسان ہوگا، (ظفر احمد نظامی، حاشیہ ۱۵، ص ۱۶۷)۔ (۴۵) ایضاً، ص ۱۲۵۔ (۴۶) خطبات آزادی، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، ۲۰۰۵، ص ۷۔ (۴۷) سید مرتضیٰ حسین فاضل، اردوے معلیٰ، حصہ اول، جلد ۲، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۹، ص ۸۴۸۔ (۴۸) اسد فیصل فاروقی، ہندوستان میں اردو طبی صحافت، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، ۲۰۱۱، ص ۷۳۔ (۴۹) ملا واحدی، دلی جو ایک شہر تھا، اوکسفورڈ، کراچی ۲۰۰۳، ص ۵۶۔ (۵۰) ایضاً، حاشیہ ۵، ص ۸۶۔ (۵۱) Yusuf Suhail, Daily Dawn, 18/10/2013. (۵۲) Andrew Chevallier, Dorling Kindersley, London, 1996, P.259. (۵۳) The Times, 30 December, 1927. (۵۴) Jawaharlal Nehru, an Autobiography, Oxford, New Delhi, 1980,

P.168 (۵۵) یونس جعفری، حسن بیگ، وقائع بابر، شہر بانو پبلشرز، کریکاڈی، ۲۰۰۷، ص ۱۔ (۵۶) ایضاً، حاشیہ ۵۵، ص ۳۵۳۔ (۵۷) Mirza Hadar Daughlat, W. M. Thackston, Tarikh Rashidi, Harvard, 1996, P.230. (۵۸) Mirza Hadar Daughlat, N. Elis, E.D. Ross, Tarikh Rashidi, Book Traders, Lahore (Year of Publication?) P.390. (۵۹) کوثر چاند پوری، حکیم اجمل خان، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۷۳ء، ص ۳۹۔ (۶۰) Mirza Haidar Daughlat, W. M. Thackston, Tarikh Rashidi, (Farsi) Harvard, 1996, P.322. (۶۱) غلام محمود خاں، قوانین حکمت شریفی، قلمی (فوٹو کاپی) ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۹ء)، ص ۴۔ (۶۲) بدر الدین، بدر الدجی۔ مطبع مصلح المطابع، دلّی، ۱۹۰۰، ص ۲۱۸۔ (۶۳) وکی پیڈیا، ملا علی قاری، ۱۸ر نومبر ۲۰۱۷۔ (۶۴) حکیم صاحب کو خاندانی خطاب ”حاذق الملک“ یکم جنوری ۱۹۰۸ء کو انگریز حکومت کی طرف سے ملا تھا۔ یہ خطاب ترک موالات کے موقعہ پر اپریل ۱۹۲۰ء کو مع تمغہ قصر ہند اور دو تمغے جو دربار ہندوستان اور انگلستان پر ملے تھے واپس کر دیے۔ اس پر عوام کی خواہش پر آپ کو مسیح الملک کا خطاب دیا گیا۔ یہ خطاب سب سے پہلے خواجہ حسن نظامی نے تجویز کیا تھا، ایضاً حاشیہ ۴۹، ص ۵۶۔ (۶۵) سید یوسف بخاری دہلوی، دلی والے، (ترتیب: عباس عقیل جعفری)، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۴، ص ۵۶-۵۹۔ (۶۶) یہ بیان علامہ اخلاق حسین دہلوی کے والد کا ہے، ایضاً، حاشیہ ا، ص ۴۲۔

فارم-IV

(رول نمبر ۸)

نام پریس:	معارف پریس، اعظم گڑھ	نام پبلشر:	ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی
مقام اشاعت:	دار المصنّفین اعظم گڑھ	قیمت:	ہندوستانی
وقفۂ اشاعت:	ماہانہ	پتہ:	دار المصنّفین، اعظم گڑھ
نام پرنٹر:	ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی	ایڈیٹر:	اشتیاق احمد ظلی
قومیت:	ہندوستانی	قومیت:	ہندوستانی
پتہ:	دار المصنّفین، اعظم گڑھ	پتہ:	دار المصنّفین، اعظم گڑھ

نام و پتہ مالک رسالہ: دار المصنّفین، اعظم گڑھ

میں ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی

اخبار علمیہ

''مذہب قرآن کی نمائش''

افغانستان کے محمد تمیم صاحبزادہ نے ۲ برسوں میں ریشم کے کپڑے پر سونے کے پاؤڈر سے قرآن کریم تحریر کیا ہے۔ رمضان کی مناسبت سے اپنی نوعیت کے اس انوکھے شہ پارے کی نمائش کا اہتمام فیروز کوہ انسٹی ٹیوٹ میں رمضان میں کیا گیا۔ محمد تمیم کا کہنا ہے کہ ریشم سے بنے صفحات پر خاص کام کرنا انتہائی دشوار مگر بہت دلچسپ اور پر ذوق عمل ہے۔ ہر صفحہ پر سونے کے پاؤڈر سے کتابت میں ایک ہفتہ لگا ہے۔ صفحات کی کل تعداد ۶۱۰ ہے اور اس کا وزن ۶ء۸ کلوگرام ہے اور اس میں ۳۰۵ میٹر ریشمی کپڑا استعمال ہوا ہے۔ (راشٹریہ سہارا، لکھنؤ ایڈیشن، ۱۳؍ مئی ۲۰۱۹ء، ص ۱۲)

''ہندوستان میں جینیاتی نقشہ بندی کی تحقیق کا منصوبہ''

دنیا کے مختلف ممالک میں "Genome Sequencing" یعنی اپنے باشندوں کی جینیاتی خصوصیات کو یکجا کر کے یہ جاننے کی کوشش عرصہ سے جاری ہے کہ ان کے اپنے اندر جینیاتی خصائص و امتیازات کیا ہیں؟ لوگوں کو کس طرح کے امراض لاحق ہو سکتے ہیں اور کس قسم کے امراض سے مقابلہ کرنے کی ان میں صلاحیت ہے؟ اب ہندوستان کے مشہور سائنسی ادارے "CSIR" (کاؤنسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ) کے حوالہ سے یہ خبر ہے کہ وطن عزیز میں نہایت منظم انداز میں یہ منصوبہ شروع کیا جا چکا ہے اور اس کے لیے پورے ملک کے دیہی علاقوں سے تقریباً ایک ہزار افراد کا انتخاب ہوگا جس کا بنیادی مقصد جنیات کی افادیت سے لوگوں کو باخبر کرنا بتایا گیا ہے۔ اس پروجیکٹ میں جن افراد کی جنیاتی معلومات کو جمع کیا جائے گا۔ ان کی اکثریت کالج اور یونیورسٹی میں لائف سائنس یا حیاتیات (بایولوجی) کے شعبہ کے طلبہ و طالبات کی ہوگی، ''سی ایس آئی آر'' کی ایک لیبوریٹری ''آئی جی آئی بی'' کے ایک سائنسداں ونود سکاریا کے مطابق اس پروجیکٹ کا مقصد صرف معلومات اکٹھا کرنا نہیں ہے بلکہ ان معلومات کے نتائج کو ایک نظام کے تحت شرکا کے سامنے رکھا جائے گا تاکہ حاصل شدہ اور ممکنہ نتائج کو وہ خود بھی دیکھ کر باخبر ہو سکیں۔ رپورٹ کے

مطابق جنیاتی معلومات اوراس کے ممکنہ نتائج سے ابھی تک صرف صاحب ثروت ودولت شہری ہی اس سے واقف تھے مگر اب اس منصوبہ کے ذریعہ عام دیہاتی افراد کو بھی واقف کرایا جائے گا۔ جنیاتی معلومات کے حصول کے لیے خون کے نمونے جمع اور ملک بھر میں تیس کیمپ لگائے جائیں گے، جس کا نمونہ لیا جائے گا اسے جنیاتی رپورٹ کارڈ جس میں بعض بنیادی معلومات درج ہوں گی، دیا جائے گا۔اس کے اندر اگر کچھ خاص دواؤں سے استفادہ کی صلاحیت نہ ہوگی تو اسے باخبر کردیا جائے گا لیکن رپورٹ میں حساس قسم کی معلومات درج نہیں ہوں گی۔ دہلی کے سی ایس آئی آر کے شعبہ آئی جی آئی بی کے علاوہ اس پروجیکٹ میں حیدرآباد کا ''سی سی ایم بی'' شامل ہے۔ حکومت ہند کے اس بڑے منصوبے کا مقصد دس ہزار ہندوستانیوں کو جنیاتی معلومات فراہم کرنا ہے۔ اس منصوبہ پر اٹھارہ کروڑ کے صرفہ کا امکان ہے۔(اردو سائنس، ماہنامہ دہلی، جون ۲۰۱۹ء، ص ۴۳)

''برگد کا درخت۔برطانوی حکومت کی سیاہ کاریوں کی ایک مثال''

پاکستان کے لنڈی کوتل آرمی کنٹونمنٹ علاقہ میں ۱۲۰/سال سے برگد کا ایک ایسا پابند سلاسل درخت ایستادہ ہے جس کے تاریخی دستاویزات اور تنے سے لٹکنے والے ایک کتبہ پر مرقوم ''میں گرفتار ہوں'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۹۸ء میں اس کو برطانوی فوجی کمانڈر جیمس اسکوائیڈ کے حکم پر قید کیا گیا تھا۔ مقامی روایت کے مطابق برطانوی حکومت نے اس آزاد علاقہ پر ناجائز قبضہ کرنے کے لیے مذکورہ فوجی کو مقرر کیا تھا۔ وہ شراب پی کر مدہوش ہوگیا تو اچانک اس کو کوئی آواز سنائی دی۔ وہ پیچھے مڑا تو اس کو محسوس ہوا کہ برگد کا یہ درخت اپنی شاخوں کو انسانی ہاتھوں کے مانند پھیلا کر اس کو پکڑنے کی کوشش کررہا ہے۔اس کی گھبراہٹ اور ڈر کی کوئی انتہا نہ رہی۔اس نے چیخ کر اپنے اردلی یعنی محافظ سپاہیوں کو بلایا اور درخت پر سروس ریوالور نکال کر تان لیا اور کہا کہ یہ درخت اس کو قتل کرنا چاہتا ہے اس لیے اس کو فوری طور پر گرفتار کرلیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے فوجی کیمپ کے اندر موجود زنجیریں نکال کر درخت کو ان سے جکڑ دیا۔اس فوری عمل درآمد سے وقتی طور پر اس کا غصہ اور خوف جاتا رہا تاہم اس کے دل سے اس کا ڈر مکمل طور پر نہیں گیا۔اس لیے اس نے اپنے میس سارجنٹ کو بندوق لے کر اپنے پاس کھڑے رہنے کا حکم دیا کہ اگر یہ درخت اس کی طرف

بڑھنے کی کوشش کرے تو اس پر بے دریغ گولیاں چلادے۔اس کے علاوہ یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ برطانوی حکومت نے اس افسر کو مقامی حریت پسند پختونوں کو دبانے کے لیے مقرر کیا تھا جس نے درخت کو قید کرنے کے بعد اس واقعہ کو علاقہ میں ڈھولچیوں کی مدد سے مشتہر کرکے تمام مزاحمتی قوتوں اور قبائلیوں کو خبردار کیا تھا کہ اگر برطانوی حکومت وفوج کے خلاف کوئی مزاحمت یا بندوق اٹھائی گئی تو اس کا انجام برگد کے درخت سے بھی برا ہوگا۔اس کی کہانی متعدد ذرائع ابلاغ کے توسط سے عالمی سطح پر شائع ہوچکی ہے۔تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ اس درخت کی گرفتاری کی ایک سوبیس سالہ تاریخ برطانوی حکومت کی سیاہ کاریوں کی واضح مثال ہے جو خود کو تو مہذب باور کراتی ہے تاہم اس کا ماضی نسل کشی اور قتل عام کے واقعات سے پُر ہے۔رپورٹ میں ایک مقامی شخص ارمان شنواری کا یہ بیان بھی نقل کیا گیا ہے کہ درخت کی گرفتاری کے محض تین برس بعد ۱۹۰۱ء میں برطانوی حکومت نے ایک سیاہ قانون منظور کیا جس کے رو سے کسی بھی قبائلی کو بغیر وارنٹ گرفتار کیا جاسکتا تھا اور فوجی افسر کے احکامات پر فوری سزا بھی دی جاسکتی تھی۔واضح رہے کہ ۱۲۰/ برس بعد بھی یہ برگد کا درخت آج بھی تروتازہ وشاداب ہے۔(منصف حیدرآباد،۱۴/جون ۲۰۱۹ء،ص ۶)

”صرف خیال وسوچ کے ذریعہ انٹرنیٹ کا استعمال“

تحقیقی مجلہ ”فرنٹیرس اِن نیوروسائنس“ میں شائع ایک تحقیق کے مطابق نینوٹکنالوجی،نینو میڈیسن،مصنوعی ذہانت اور کمپیوٹنگ میں روز افزوں ترقی کے نتیجہ میں اس صدی میں ایک ایسا نظام تیار ہوجائے گا جس کے ذریعہ دماغ میں موجود نیورون اور سیناپسیز کو سحابی کمپیوٹنگ کے نیٹ ورک سے جوڑا جاسکے گا۔انتہائی چھوٹے سائز کے روبوٹس کے توسط سے دماغ میں موجود نیوکورٹیکس کو کلاؤڈ کمپیوٹنگ میں استعمال کیے جانے والے مصنوعی نیوکورٹیکس سے جوڑ دیا جائے گا۔نیورل نینو روبوٹس دماغ کے اندر شریانوں میں ادھر ادھر منتقل ہونے اور از خود کسی ایک حصہ میں حسب ضرورت رکنے کی صلاحیت رکھیں گے اور وہیں سے بغیر کسی تار کے پیغام کمپیوٹر کے نیٹ ورک کو بھیج دیں گے اور اس طرح جسمانی حرکت کے بغیر انٹرنیٹ کا استعمال ممکن ہوجائے گا۔(اردو سائنس،ماہنامہ دہلی، جون ۲۰۱۹ء،ص ۴۳)

(ک۔ص،اصلاحی)

یادگار شبلی دارالمصنّفین یا مسلم اکاڈمی

اشتیاق احمد ظلی

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے نکلی ہوئی یہ قیمتی تحریر گذشتہ دنوں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں دریافت ہوئی۔ یہ گزٹ کے ۱۷ فروری ۱۹۱۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ غالباً یہ فروری کی کسی ابتدائی تاریخ میں لکھی گئی ہوگی۔ چنانچہ یہ مراسلہ علامہ شبلی کے انتقال کے تقریباً ڈھائی مہینہ بعد لکھا گیا جب دارالمصنّفین کے قیام کے تعلق سے ابتدائی اقدامات کیے جا چکے تھے۔ علامہ کی زندگی کے آخری دنوں میں جائداد کے وقف کے لیے دوسرے شرکاء کی منظوری حاصل کی جا چکی تھی اور وقف نامہ تحریر کیا جا چکا تھا اور اس پر دستخط کرائے جارہے تھے۔(۱) یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال کے چند دنوں بعد ہی ۲۴ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمیدالدین فراہی کے برادر خورد حاجی رشیدالدین کی مساعی جمیلہ سے وقف کے بقیہ مراحل بھی مکمل ہوگئے۔(۲) مولانا سید سلیمان ندوی کے نام علامہ شبلی کے مکتوب مورخہ ۱۰/۱ اکتوبر ۱۹۱۴ء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ایک مختصر دارالضیوف بن چکا تھا۔(۳) شدید بیماری کے باوجود وہ دارالمصنّفین کی تاسیس سے متعلق کاموں میں پوری دلچسپی لے رہے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کے ذہن میں بہت سے منصوبے تھے۔(۴) انہیں امید تھی کہ اگلے چند مہینوں میں اپنے بعض احباب کو دارالمصنّفین کو دیکھنے کے لیے مدعو کرسکیں گے۔(۵)

دارالمصنّفین کے تعلق سے جو حل طلب مسائل درپیش تھے ان میں ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اس کا مرکز کہاں ہو۔ علامہ شبلی ابتدا ہی سے اسے ندوہ میں بنانا چاہتے تھے لیکن اس وقت کے حالات میں یہ ممکن نہیں تھا۔(۶) جب مولانا مسعود علی ندوی نے ان کو لکھا کہ دارالمصنّفین لکھنؤ میں اور ندوہ کے احاطہ میں قائم ہو تو اس کے جواب میں ۲۷ جولائی ۱۹۱۴ء کو ان کو لکھا: ''بھائی وہ لوگ دارالمصنّفین کو

ندوہ میں کب بنانے دیں گے کہ میں بناؤں۔ میری اصلی خواہش یہی ہے لیکن کیا کیا جائے، حالانکہ اس میں انہی کا فائدہ ہے"۔(۷) مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے جب دارالمصنّفین کے لیے حبیب گنج کی پیشکش کی تو جواب میں ان کو لکھا: "آپ دارالمصنّفین کو حبیب گنج لے جانا چاہتے ہیں تو حضرت میں اعظم گڑھ کیوں نہ پیش کروں۔ اپنا باغ اور دو بنگلے پیش کرسکتا ہوں"۔(۸)

یہ مسئلہ زیرغور ہی تھا کہ مولانا سید سلیمان ندوی کے بقول قاضیِ تقدیر نے خود ہی اس کا فیصلہ کردیا۔ وہ لکھتے ہیں: "بالآخر دارالمصنّفین کے مرکز کے مسئلے کا قطعی فیصلہ خود قاضی تقدیر نے کردیا یعنی اگست ۱۹۱۴ء میں ان کے عزیز بھائی مولوی محمد اسحاق مرحوم کی موت نے ان کو اعظم گڑھ آنے پر مجبور کیا۔ یہاں سکون واطمینان نظر آیا تو اسی شہر کو اپنے مقاصد کا مرکز بنانے کا فیصلہ کرلیا"۔ (۹) چنانچہ ۴ ستمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا مسعود علی صاحب کو لکھا: "میں نے یہاں اپنا مستقل انتظام کرلیا ہے۔ ہر طرح کا آرام اور پھیلاؤ ہے، کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں۔ بالکل ایک بادشاہت معلوم ہوتی ہے۔ دارالمصنّفین بھی شروع ہوجائے گا"۔(۱۰)

مولانا سید سلیمان ندوی کے محولہ بالا بیان اور ان خطوط کے محتویات سے یہ بات واضح طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ علامہ شبلی کے انتقال سے پہلے اس بات کا فیصلہ ہوچکا تھا کہ دارالمصنّفین کہاں قائم ہوگا لیکن اس مراسلہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم فروری ۱۹۱۵ء کی ابتدائی تاریخوں تک حتمی طور پر یہ مسئلہ طے نہیں ہوا تھا اور دارالمصنّفین کے مرکز کی حیثیت سے لکھنؤ اور اعظم گڑھ کے درمیان آخری اور قطعی فیصلہ ہونا باقی تھا۔ اس مراسلہ کے سیکشن ۳ میں سید صاحب لکھتے ہیں: "اس کا محل وقوع کیا ہوگا" پھر سیکشن ۴ میں تحریر فرماتے ہیں: "اکاڈیمی کا مرکز لکھنؤ ہوگا یا اعظم گڑھ"، آگے سیکشن ۵ میں لکھتے ہیں: "اگر اعظم گڑھ مرکز ہو تو زمین اور مکان ایک مدت تک کے لیے کافی ہے۔ تھوڑی ترمیم اور استحکام کی ضرورت ہوگی"۔

علامہ شبلی کا انتقال ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو ہوا۔ اس وقت تک دارالمصنّفین کی تاسیس کے متعلق ابتدائی تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں، جیسا کہ پہلے تذکرہ ہوا۔ اخوان الصفا کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ ان سب کے دو ڈھائی مہینہ بعد معمار دارالمصنّفین لکھتے ہیں کہ مرکز کا حتمی فیصلہ ابھی باقی ہے۔ چوں کہ اس موضوع پر کسی طرح کی کوئی تفصیل دستیاب نہیں ہے اس لیے اس سلسلہ میں کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔

البتہ یہ ظاہر ہے کہ معمار دارالمصنّفین کا یہ لکھنا بے سبب نہیں ہوسکتا۔

اس مراسلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کے انتقال کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے ''مولانا شبلی کے آخری اعمال مبرورہ'' کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین لکھا تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ اپنی حیات مستعار کے آخری دنوں میں کیا کر رہے تھے اور کیا کرنا چاہتے تھے۔ اس کا کچھ اندازہ نہیں کہ یہ سلسلہ کتنے مضامین پر مشتمل تھا اور کہاں شائع ہوا۔ یہ اس سلسلہ میں پہلی اطلاع ہے اور اس کا کہیں اور ذکر نہیں ملتا۔ یہ مضامین مل جاتے تو بہت قیمتی چیز ہوتے۔

جب یہ مراسلہ لکھا گیا تھا اس وقت تک دارالمصنّفین کی مجلس منتظمہ اور مجلس عاملہ کی تشکیل نہیں ہوئی تھی۔ اس میں بیگم صاحبہ بھوپال سے بہ پیٹرن اور نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی سے صدارت کی درخواست کا ذکر ہے۔ چند مہینوں بعد جب ۲۵ مئی ۱۹۱۵ء مجلس منتظمہ کی تشکیل ہوئی تو نواب عماد الملک بلگرامی اس کے صدر مقرر کیے گئے (۱۱) البتہ بیگم صاحبہ بھوپال کا کوئی ذکر اس سلسلہ میں نہیں آتا۔

مراسلہ میں شبلی اکیڈمی کے بجائے مسلم اکاڈیمی کا لفظ استعمال کیا گیا۔ دارالمصنّفین کے تعلق سے اس لفظ کا استعمال کہیں اور نہیں ہوا ہے۔ اس میں دارالمصنّفین کے سلسلہ میں جن بلند مقاصد اور عزائم کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کم وبیش پورے ہوئے۔ اس میں ہر چار مہینہ میں قوم کے سامنے ایک نئی تصنیف پیش کیے جانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اگر گذشتہ سوسال کے عرصہ میں اس باب میں دارالمصنّفین کی کارکردگی کو دیکھا جائے اور ادارہ کی تمام مطبوعات کو سامنے رکھا جائے تو شکر کا مقام ہے کہ یہ ہدف بڑی حد تک پورا ہوا۔ دوسرے جن مقاصد اور اہداف کا اس میں ذکر کیا گیا ہے اور جو اس کی تاسیس کے وقت پیش نظر تھے وہ بھی کم وبیش پورے ہوئے۔ کسی بھی ادارہ کے لیے کارکردگی کا یہ معیار قابل شکر بھی ہے اور قابل فخر بھی۔ البتہ ایک ہدف ایسا بھی تھا جس کا خواب اس ادارہ کے عالی مرتبت معمار نے دیکھا تھا جس کو پورا کرنے کے اسباب مہیا نہیں ہوسکے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس مراسلہ میں دارالمصنّفین کے جن مقاصد اور اہداف کا ذکر کیا تھا ان میں سے ایک یہ تھا: ''ملک میں مصنّفین کو مالی و مادی معاونت دے گی''۔ مالی اور مادی وسائل کے سلسلہ میں دارالمصنّفین گذشتہ ایک صدی کے دوران جن حالات اور مسائل سے

دو چار رہا ہے وابستگان و ہمدردان دارالمصنّفین ان سے بخوبی واقف ہیں۔ان حالات میں اس نے اپنے وجود کو جس طرح باقی رکھا وہ عزم وحوصلہ اور صبر وقناعت کی ایک لازوال داستان ہے۔ اگر قوم نے دست تعاون بڑھایا ہوتا تو اس نے یہ فریضہ بھی انجام دینے کا امتیاز حاصل کیا ہوتا۔

ولو أنّ قومی انطقتنی رماحهم نطقت ولکن الرماح اجرّت

یہ نہایت قیمتی تاریخی دستاویز ہدیۂ ناظرین ہے۔

یادگارِ شبلی ـ دارالمصنّفین یا مسلم اکاڈمی

سید سلیمان ندویؒ

لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ.(۱۲)

(۱)

انسان فانی ہے لیکن اس کا کام غیر فانی ہے۔شہیدانِ راہِ خدا کی زندگی اگر رگِ گردن کے خون سے ہے تو شہیدوں کی ایک اور جماعت ہے جو دل کے خون سے جیتی ہے،جس کی انگلیوں میں آبِ حیات کا خزانہ ہے جو دوات کی سیاہی سے ابلتا ہے اور کاغذ کی (کذا) میں پھیلتا ہے۔

ہم نے دہلی مرحوم کے خزانے مٹا کر جو کچھ پایا وہ چند ہستیاں تھیں جن کی قیمت خزانوں سے گراں تر تھی۔ جو خود خزانہ دار نہ تھیں لیکن ہم کو خزانہ دار بنا گئیں۔آج ہم کو یہ غور کرنا ہے کہ ان کی روحانی لازوالی اور روحانی ثبوت کو مادی بقا اور مادی ثروت کی صورت میں بدل سکتے ہیں۔وہ باقی ہیں لیکن وہاں جہاں ہم ان سے مل نہیں سکتے ہیں۔وہ ثروت مند ہیں لیکن وہاں جہاں ہم ان سے متمتع نہیں ہوسکتے۔ہم مادی ہیں،ہم کو مادی یادگار کی ضرورت ہے۔

(۲)

حجۃ الملۃ والدین شمس العلماء علامہ شبلی نوراللہ مرقدہ جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف ہمارے لیے تھا،جن کی انگلیوں نے حیات ملی (کو) حیات جاوید بخشی،جن کی زبان نطق فرمانے ہماری روح ایمان کو تازگی بخشی،جن کے اعمال مبرورہ قومی عمارت کے ستون ہیں،جن کے خامہ اعجاز نے بزرگوں کی روح کو ہماری نگاہوں میں مجسم کیا۔کیا ہم طیار نہیں کہ ان کی یادگار کے لیے

جنبش اپنے دست اعانت میں اوراضطراب اپنے دل قدر شناس میں پیدا کریں۔

مولانا کی یادگار میں سب سے بہتر یہی ہے کہ ان کے ناتمام و پیش نظر ارادوں کی تکمیل کی جائے۔ ''مولانا شبلی کے آخری اعمال مبرورہ'' کے عنوان سے جو سلسلہ مضامین ہم نے لکھا ہے اس کے پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ وہ کیا کررہے تھے اور کیا کرنا چاہتے تھے۔

ندوۃ العلماء وابستگان مولانا مرحوم کے ہاتھ میں نہیں ورنہ خود اس کی ترقی مولانا کی بہترین یادگار تھی، سیرت نبویؐ کی تکمیل ایک بہترین یادگار ہے مگر بحمداللہ اس کی تکمیل کا بار ایک خصوصی جماعت نے اپنے سر لے لیا ہے۔ سرائے میر کا مدرسہ عربیہ بھی محل یادگار ہے لیکن اس کے لیے اور سامان پیش نظر ہیں۔ نیشنل اسکول بھی ان کے ہاتھ کی صنعت ہے لیکن مقامی احباب اس کی تکمیل کے ذمہ دار ہیں۔ ان سب سے اہم اور اکبر دارالمصنّفین ہے جو مولانا کے نظام عمل کا آخری خاکہ تھا۔

(۳)

دارالمصنّفین کی ضرورت پر احباب نے راولپنڈی کی کانفرنس میں مباحثہ و مذاکرہ کی زحمت اٹھائی لیکن معاملہ تا بحد فیصلہ نہ پہونچا۔ (۱۳) مولانا کی اسکیم اس کے متعلق کیا تھی؟ کن اصولوں و مقاصد پر اس کی بنیاد ہوگی؟ اس کا محل وقوع کیا ہوگا؟ اب تک اس کے لیے کیا ہو چکا ہے اور کیا ہونا باقی ہے؟ آئندہ سلسلوں میں ان پر مفصل گفتگو ہوگی۔ نواب عمادالملک بلگرامی حیدرآباد، نواب صفی الدولہ سید علی حسن خاں لکھنؤ، مولانا حبیب الرحمن خان شروانی، مولانا حمیدالدین بی۔اے، پرنسپل دارالعلوم حیدرآباد، مولانا ابوالکلام آزاد، مسٹر عبدالماجد بی۔اے، پروفیسر عبدالقادر ایم۔اے (پونہ)، مفتی انوارالحق ایم۔اے، ڈائریکٹر تعلیم بھوپال، پروفیسر نواب علی (بڑودہ) اور دیگر مشاہیر ارباب علم سے اس مسئلہ کے متعلق زبانی و تحریری گفتگو ہوچکی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس تحریک سے متفق ہے۔

(۴)

دارالمصنّفین کے متعلق مختصراً عرض یہ ہے کہ ایک عظیم الشان اسلامی اکاڈیمی ہوگی۔ اس کے احاطہ میں مشرقی و مغربی علوم کا کتب خانہ ہوگا۔ مصنّفین اور مترجمین کی اس میں ایک جماعت ہوگی جو ہر چار مہینہ پر قوم میں کوئی نئی تصنیف پیش کرے گی۔ رسالوں کے ذریعہ سے مفید مضامین کا سلسلہ شروع ہوگا۔ ملک میں مصنّفین کو مالی و مادی اعانت دے گی۔ عربی و انگریزی خواں مستعد طلبہ کی فن تصنیف و تالیف کی تعلیم دی جائے گی۔ عربی خواں طلبہ کے لیے مطالعہ اعلیٰ کے مواقع

فراہم ہوں گے۔اردو زبان کی تکمیل و ترقی کے وسائل پیدا کیے جائیں گے۔اسلامی علوم وفنون کے عظیم الشان مباحث و معلومات پر سلسلہ تصانیف شروع ہوگا۔علوم مغربی پر عام فہم کتابیں لکھائی جائیں گی۔ملک کے مشاہیر علم وفن ان کے ممبر ہوں گے۔

اکاڈیمی کا مرکز لکھنؤ ہوگا یا اعظم گڑھ۔اگر درخواست کی جائے گی تو امید ہے ہر ہائی نس فرماں روائے مملکت بھوپال پیٹرن ہونا اور نواب عماد الملک مولانا سید حسن صاحب بلگرامی پریسڈنٹ ہونا قبول فرمائیں، یوروپ کے بعض مشہور اسکالرس کی بھی شرکت کی امید ہے۔

(۵)

اکاڈیمی کو بالفعل چار چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ایک عمارت، ایک وسیع کتب خانہ، چند مصنّفین کے لیے سامان وظائف، سامان طبع و اشاعت۔کتب خانہ عربی ہمارے پاس ایک حد تک کافی موجود ہے۔کچھ انگریزی کتابیں بھی ہیں۔اگر اعظم گڑھ مرکز ہو تو زمین اور مکان ایک مدت کے لیے کافی ہے۔تھوڑی ترمیم اور استحکام کی ضرورت ہوگی۔سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ مصنّفین کے وظائف اور محکمہ طبع و اشاعت کے مصارف کا سامان کیا جائے۔ پچھلی ضرورت بغیر یکمشت عطیوں کے پوری نہیں ہو سکتی جس کی مقدار کم از کم دس ہزار روپیہ ہے۔ دوسری ضرورت کی تدبیر یہ ہے کہ ملک کے تمام علم دوست اور خصوصاً معتقدین شبلی سے درخواست کی جائے کہ وہ اس کی ممبری قبول فرمائیں۔

ملک کے تمام ارباب اختصاص سے جن کا دل اپنے ملک کے علمی فقر اور اپنی زبان کے علمی افلاس پر روتا ہے، وہ اپنی زبان کو معارف اور علوم سے مالا مال دیکھنا چاہتے ہیں، جو اپنے مذہب کے سرمایہ اطلاعات کے طالب ہیں، کیا ان سے یہ امید بیجا ہوگی کہ وہ اس تجویز کی فعلیت و تقویت کے لیے زبان، ہاتھ اور دل کی اعانت کی آمادگی ظاہر فرمائیں۔

کام کی ابتدا مارچ ۱۹۱۵ء سے شروع ہوجائے گی۔اس کے لیے ہر قسم کے عطیہ یا درخواست ممبری، قسم ممبری کی اطلاع ابھی سے مرسل ہونا چاہیے۔مفصل قواعد و مقاصد اربابِ دستور کے زیر نظر ہیں، عنقریب شائع ہوں گی۔

خط و کتابت کا پتہ: سید سلیمان ندوی

شبلی منزل، اعظم گڑھ

حواشی

(۱)مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص ۶۴۲؛ مولانا سید سلیمان ندوی (مرتب) مکاتیب شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء، جلد دوم، ص ۷۴۔ (۲) مولانا شاہ معین الدین ندوی، حیات سلیمان، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، بدون تاریخ، ص ۹۷۔ (۳) مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۰۱۔ (۴) مولانا سید سلیمان ندوی (مرتب) مکاتیب شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء، جلد اول، ص ۲۰۰۔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھتے ہیں کہ ”پر لطف تجویزیں دارالمصنّفین کے سلسلہ میں ذہن میں ہیں“۔ (۵) مکتوب بنام نواب حسن علی خاں، مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۵۴۔ (۶) حیات شبلی، ص ۶۴۰ - ۶۴۱۔ (۷) حیات شبلی، ص ۶۴۱، مکاتیب شبلی، حصہ دوم، ص ۱۰۹۔ (۸) حیات شبلی، ص ۶۴۰، مکاتیب شبلی، جلد اول، ص ۲۰۰۔ (۹) حیات شبلی، ص ۶۴۱۔ (۱۰) مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۱۸۔ (۱۱) حیات سلیمان، ص ۹۹ - ۱۰۰۔ (۱۲) اس مفہوم کو قرآن مجید میں دو مختلف مقام پر قدرے مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ربانی ہے: ” وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ “ (البقرہ: ۱۵۴)، دوسری جگہ فرمایا گیا ” وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ “ (آل عمران: ۱۶۹)، غالباً یادداشت کی مدد سے لکھنے کی وجہ سے دونوں آیتوں کے الفاظ خلط ملط ہو گئے ہیں۔ یہ کاتب کی غفلت اور لاپرواہی کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے۔ (۱۳) آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کا اٹھائیسواں اجلاس راولپنڈی میں ۲۷ - ۲۹ دسمبر ۱۹۱۴ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی نے علامہ شبلی کی وفات میں ریزولیوشن پیش کیا۔ اس پر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور مولانا محمد علی نے اظہار خیال کیا۔ مولانا محمد علی نے اس ضمن میں علامہ شبلی کے دارالمصنّفین کے تاسیس سے متعلق منصوبہ کا بھی ذکر کیا اور اس کے قیام کی ضرورت پر اظہار خیال کیا۔ دیکھیے رپورٹ متعلق اجلاس بست وہشتم، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بمقام راولپنڈی، انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ، ص ۱۳۲ - ۱۳۵۔

معارف کی ڈاک

مکتوب اورنگ آباد

مدرسہ کاشف العلوم، پوسٹ باکس: ۹۱
اورنگ آباد، مہاراشٹر

محترمی! زاد اللہ معارفکم

معارف جلد نمبر ۲۰۳ / عدد ۴ (اپریل ۲۰۱۹ء) میں جناب وارث ریاضی صاحب مراسلہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت مولانا قاری طیب صاحب کو پاکستان سے ہندوستان لانے میں مولانا حسین احمد مدنی کی کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔

یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ وضاحت درج ذیل ہے:

مولانا عزیز الحسن صدیقی صاحب بہ عنوان ''قاری طیب صاحب چند یادیں'' لکھتے ہیں:

''تقسیم ہند کے بعد قاری صاحب ترک سکونت کر کے پاکستان چلے گئے اور جب انہوں نے وہاں علم وعلما کی توقیر میں کمی دیکھی تو ہندوستان آنے کا قصد کیا۔ ظاہر ہے یہ کام مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ شہریت کی تبدیلی کا سوال تھا مگر حضرت شیخ الاسلام نے وزیراعظم ہند پنڈت نہرو سے کہا ''دارالعلوم کے لیے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کی ہندوستان واپسی بے حد ضروری ہے'' نہرو نے کچھ عذر کیا تو شیخ نے فرمایا ''مہتمم تو دارالعلوم کو بہت مل جائیں گے مگر مولانا نانوتویؒ کی اولاد ہم کہاں سے لائیں''، پھر دنیا نے دیکھا کہ حضرت قاری صاحب کو دارالعلوم کی مسند اہتمام بھی ملی اور ہندوستان کی شہریت بھی۔ برسبیل تذکرہ یہ کہنے میں کیا حرج ہے کہ پنڈت جی کی یہ خصوصیت تھی کہ علما کی عزت وتوقیر کیا کرتے تھے۔ آزادی سے ذرا پہلے آل انڈیا کانگریس کا اجلاس مئوناتھ بھنجن میں ہورہا تھا، بڑے بڑے قومی رہنما اس اجلاس میں شریک تھے۔ پنڈت جی غازی پور ہوتے ہوئے مئو پہنچے اور سب سے پہلے مولانا مدنی کی قیام گاہ پر حاضری دی اور شیخ کے سامنے دیر تک دوزانو بیٹھے رہے''۔ (حکیم الاسلام دارالعلوم دیوبند کی ایک مظلوم شخصیت، مولف محمد اسعد صدیقی، ص ۱۲۱/ادارہ انوارالقرآن، دیوبند ۲۰۰۶ء، جلد دوم)

دوسری وضاحت............رائے کے اختلاف کے باوجود دیانت داری کی بات یہ ہے کہ مولانا مدنی اپنی بے نیازانہ طبیعت کے باوجود خود جواہر لال نہرو کے پاس گئے جو اس وقت وزیر اعظم تھے۔ اس معاملے میں ان سے مداخلت کے لیے کہتے ہوئے ان (مدنیؒ) کے الفاظ یہ تھے کہ: ''میں اپنی زندگی بھر سیاسی خدمت کا یہ صلہ سمجھتا ہوں کہ آپ حضرت مولانا قاری محمد طیب کو ہندوستان لے آئیں''، چنانچہ سب قانونی مرحلے طے ہوئے اور قاری صاحب ہندوستان واپس تشریف لائے تو دیوبند کے اسٹیشن پر مولانا مدنی نے ان کا استقبال کرتے ہوئے بے ساختہ یہ شعر پڑھا ؎

اے تماشا گاہ عالم روئے تو　　تو کجا بہر تماشا می روی

''یعنی لوگ تو خود تیرے دیدار کے لیے منتظر ہیں تو کہاں دیدار کرانے کے لیے جاتا ہے۔''

از تحریر مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، مفتی پنجاب (حکیم الاسلام دارالعلوم دیوبند کی ایک مظلوم شخصیت، ص ۱۲۱، ادارہ انوار القرآن، دیوبند ۲۰۰۶ء، جلد اول)

حضرت مدنی کی تواضع اور مہتمم قاری طیب صاحب سے حوصلہ افزا مخاطبت ''مت گھبرایئے اور صبر واستقلال اور عالی ہمتی اور خوش دلی کے ساتھ اس باغ محمدی کو سرسبز وشاداب کیجیے، فیوض قاسمی کو چار دانگ عالم میں منتشر کیجیے، زمانے کی تیز وتند ہوائیں چلیں گی، سمندروں کی موجیں تھپیڑ ے ماریں گی، خواہشات کے زلزلے آئیں گے، مگر آپ کو ہمالیہ بننا چاہیے۔ پرواہ مت کیجیے اور سعی پیہم میں مردانہ وار گامزنی کرتے رہیے۔ حضرت قاسم قدس سرہ العزیز نے اگر لوگوں کی چلمیں بھر بھر کر اور پاؤں دبا دبا کر ان کو راہ پر لانے کا شیوہ اختیار کیا تو ان کے اخلاف صدق کو اس میں عار نہ آنا چاہیے اور نہ گھبرانا چاہیے اور ہمت بلند رہنی چاہیے۔ ہم نا کارے، بدنام کنندہ نکونامان آپ کے ساتھ ہیں''۔ از مکتوب شیخ الاسلام، جلد دوم، از مولانا عبدالقدوس حماد قاسمی بحوالہ (حکیم الاسلام دارالعلوم دیوبند کی ایک مظلوم شخصیت، ص ۱۹۱، ادارہ انوار القرآن، دیوبند ۲۰۰۶ء، جلد دوم)

تیسری وضاحت: ناز انصاری سابق ایڈیٹر الجمعیت دہلی لکھتے ہیں: ''جب تقسیم ہند کے بعد حضرت قاری صاحب پاکستان تشریف لائے (غالباً ترک وطن کے ارادہ سے) تو حضرت شیخ مدنی چین سے نہ بیٹھے۔ لوگوں نے قاری صاحب کو بلانے کی مخالفت کی مگر آپ فرماتے تھے کہ ''میں حجت الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم کو کیا منہ دکھاؤں گا''۔ ان کو واپس لانے کے لیے

دلی کے کئی سفر کیے، پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ذریعہ کوشش کرتے رہے، جب تک قاری صاحب کو واپس نہ لے آئے انہیں سکون حاصل نہ ہوا۔

معارف مئی کے شمارے کا انتظار تھا کہ شاید اس میں مذکورہ قضیہ کی وضاحت وصفائی ہوگی لیکن مئی کے شمارہ دیکھنے سے مایوسی ہوئی۔ اب یہ تحریر ارسال ہے، امید کہ معارف کے پڑھنے والوں اور اہل علم کے لیے معلومات افزا ہوں گی۔

(ع۔و۔ح، اورنگ آباد)

مکتوب علی گڑھ

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

''معارف'' اپریل ۲۰۱۹ء کے ''رسید کتب موصولہ'' والے صفحہ پر ایک کتاب ''قرآن کی ترتیب نزولی'' کے عنوان سے ذکر کی گئی ہے۔

تفصیلی رائے تو مذکورہ کتاب کو دیکھ کر ہی دی جاسکتی ہے لیکن اتنا کہنے میں تامل روا نہیں کہ یہ حرکت پہلے مستشرقین نے کی تھی کہ ''قرآن پاک'' کو نزولی ترتیب سے مرتب کیا جائے، مستشرقین اس طرح کے اپنے ہر کام میں اپنے خفیہ مقاصد رکھتے ہیں جو حتماً اسلام کو نقصان پہنچانے کی نیت پر مبنی ہوتے ہیں۔ مستشرقین کے کاموں سے گمراہ ہو کر اب ہمارے بعض علما بھی یہ کام کر رہے ہیں۔ کچھ برسوں پہلے پاکستان میں بھی ایک صاحب نے یہ کام شروع کیا تھا (معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہوا)۔

''ترتیب نزولی'' کا کوئی فائدہ یا اس کی مسلمانوں کو ضرورت ہوتی تو اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کی زندگی ہی میں اس کو محفوظ کرا دیتا، لیکن ایک ایک آیت، ایک ایک سورت اللہ کے حکم سے فرشتے نے نبی کریمؐ کو بتا کر محفوظ کرائی اور حضور ﷺ نے مکمل قرآن پاک اللہ کی بتائی ہوئی ترتیب پر لکھوا کر محفوظ فرما دیا، تو اب قیامت تک نزولی ترتیب پر جمع کر کے مدون اور عوام تک پہنچانا ایک مذموم عمل ہی مانا جائے کیوں کہ وہ خدا اور رسول ﷺ کی مخالفت اور قرآن کے ساتھ بیجا دست برد کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے مخالفین اسلام غلط فائدہ اٹھائیں گے اور اسلام کو نقصان پہنچائیں گے۔

جویائے خیر رئیس احمد نعمانی

ادبیات

غزل

جناب جمیل مانوی

آئینہ بن کے ترا حسن سراپا ہوجاؤں
تیری آنکھوں میں رہوں تیری تمنا ہوجاؤں

بے دھیانی میں بہت دور نکل آیا ہوں
اب اگر لوٹوں تو اپنوں میں پرایا ہوجاؤں

بھولی بھٹکی کسی خوشبو کی ذرا سی آہٹ
سن کے ہر سانس یہ کہتی ہے دریچہ ہوجاؤں

شوقِ آوارگی ہر بار مچل جاتا ہے
عمر ہر بار یہ کہتی ہے کہ گھر کا ہوجاؤں

میرے پیروں میں کئی رشتوں کی زنجیریں ہیں
مجھ کو اس طرح نہ چاہو کہ اکیلا ہوجاؤں

اب جو دنیا سے گریزاں ہوں تو یہ سوچ کے ہوں
میں کسی کا نہیں ہوسکتا تو اپنا ہوجاؤں

درد کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو ہے یہ دل
جو یہی سوچتا رہتا ہے کہ دریا ہوجاؤں

بھول جاؤں کہ مری زیست کا مقصد کیا ہے
خود سے دھوکا کروں اور سب کا چہیتا ہوجاؤں

خود کو انساں نے ابھی جانا ہی کتنا ہے جمیلؔ
سچ اگر کہہ دوں زمانے میں تماشہ ہوجاؤں

☆ ۴۳۰، گریس اکیڈمی، نور بستی، سہارنپور۔

غـــزل

جناب محمد امین احسن☆

اٹھو دیکھو سویرا ہوچکا ہے
مقدر کیا تمہارا سوچکا ہے

غرور حسن سے بھی پوچھ لینا
وہ اپنی بے بسی پہ روچکا ہے

زمیں سے آسماں تک ہے اجالا
وہ سارے داغِ دامن دھو چکا ہے

اسی کا بول بالا ہے جہاں میں
عداوت جو دلوں میں بوچکا ہے

ہنسی دوپل کی قیمت جانتا ہے
جو ساری عمر اپنی روچکا ہے

تجھے کیا فکر ہے دنیا بتادے
وہ جس کا تھا اسی کا ہوچکا ہے

جسے سمجھا تھا جان زندگانی
وہ تخم نارسائی بوچکا ہے

چلے آؤ تمہارے منتظر ہیں
اشارہ یار کا یہ ہوچکا ہے

کہاں کا حکم، کیسی حکمرانی
جو ہونا تھا وہ سب کچھ ہوچکا ہے

گریباں میں وہ اپنے جھانک لیتا
جو اپنی قدر و قیمت کھوچکا ہے

امیں کے سر پہ اپنا ہاتھ رکھنا
بہت قسمت کو اپنی روچکا ہے

☆بلریا گنج، اعظم گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

کلیم احمد عاجزؔ ''وہ ایک شاخ نہال غم''، از پروفیسر محسن عثمانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۹۶، قیمت ۲۸۰ روپے، پتہ: ہدیٰ پبلی کیشنز، ۴۵۵-۴ نیر سٹی سول کورٹ، پرانی حویلی حیدر آباد۔

سچی، ستھری، معصوم، مقبول اور ذمہ داری سے کہا جائے تو مقدس شاعری، اردو کے جن شعراء کے نصیب میں آئی، ان میں جناب کلیم عاجزؔ سے شاید ہی کوئی صرف نظر کرسکے۔ زیر نظر کتاب اسی خیال کی تائید و توثیق ہے کہ بیسیوں صاحبان نقد و نظر اور سخن شناسوں نے کلیم عاجزؔ کے کلام معجزانہ کا مشاہدہ کیا اور پھر اپنے ایمان کا اعلان کیا، ان میں پروفیسر کلیم احمد اور علامہ جمیل مظہری، کنہیا لال کپور بھی ہیں اور وہ بھی جن کے دم سے ادب صالح کا وجود حرف غلط کی طرح مٹ نہیں سکا، فاضل مرتب کی انشاء پردازی اور ادبی گل کاری کا زمانہ معترف ہے کہ ان کا مقدمہ اور اس سے بڑھ کر شخصیت، شاعری کے عنوان سے مقالہ اس مجموعہ مضامین کو بڑا وقیع بنا دیتا ہے، کلیم عاجزؔ کا اگر صرف کلام سامعین و قارئین کے سامنے ہوتا تو دل و دماغ پر میر تقی میرؔ خود بخود دستک دیتے نظر آتے لیکن کلیم صاحب نے ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا'' لکھ کر یہ حقیقت عیاں کردی کہ غم کی شدت اور آنسوؤں کی ایسی برسات کہیں اور مل ہی نہیں سکتی، ان کے اشعار کا انتخاب سب سے مشکل کام ہے کہ ہر شعر درد و غم کا ایسا مجموعہ ہے جہاں پڑھنے والے کو خود اپنا ہوش نہیں رہتا۔ وہ خود ایسا خانہ خراب بن جاتا ہے کہ جس کی زندگی کبھی چھاؤں میں بسر نہ ہوسکی، ایسے میں دوش سے کمر تک زلف کے سیاہ بادل چھائے بھی تو کیا۔ شمع اور پروانہ موضوع کب نہیں رہا، لیکن یہ تیور کہاں کہ سلگنا تو کچھ اور ہی چیز ہے، جل کے مرجانے سے کیا ہوتا ہے؟ کلیم عاجزؔ کا جگر ہی کہہ سکتا ہے کہ جو کام ہم سے ہوا وہ پروانے سے کیا ہوگا۔ غموں کا ایسا بانکپن جب خاصہ خاصان رسلؐ کے دربار میں حاضر ہوتا ہے تو دیکھیے کیا ہوتا ہے ؎

کھو کے بازار میں سب اپنا بھرم آئے ہیں ‏ ‏ ‏ شرم کہتے ہوئے آتی ہے کہ ہم آئے ہیں

کتاب کا ہر مضمون کیفیات سے لبریز ہے۔ فراقؔ جیسا نقاد اگر یہ کہے کہ کلیم عاجزؔ کی شاعری میں بے نام جادو سا ملتا ہے یا یہ کہ کلیم عاجزؔ کی شاعری پر کچھ کہتے ہوئے اپنے آنسو مشکل سے روک پائے تو پھر واقعی اس سے زیادہ کسی کلام کا اعتراف اور کیا ہوگا۔ ایسے میں سکہ بند اور وردی پوش مدعیان ادب کا ذکر بھی عبث ہے۔

ع۔ص

رسید کتب موصولہ

اسلام کی آغوش میں: مولانا ثناء اللہ عمری، ادارہ تحقیقات اسلامی، جامعہ دارالسلام عمرآباد۔

قیمت: ۱۵۰/روپے

افسانوی ادب اور حیات اللہ انصاری: محمد اویس سنبھلی، ناشر احساس ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر فاؤنڈیشن ٹرسٹ، بارودخانہ گولہ گنج لکھنؤ۔ قیمت: ۲۹۹/روپے

انوار تحقیق: ڈاکٹر سید شاہد اقبال، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ممبئی۔ قیمت: ۲۸۰/روپے

بہار کے معاصر افسانہ نگار: ڈاکٹر آفتاب عالم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ قیمت: ۲۰۱/روپے

جبل پور میں اردو (۱۹۵۶ء تک): فیروز کمال، اشفاق کمال، کمال کمپیوٹرس گوہل پور، جبل پور۔

قیمت: ۲۵۰/روپے

خوش نویسان طب ایک جائزہ: حکیم وسیم احمد اعظمی، ۵۸۳۔شیخو پورا کالونی، وکاس نگر، لکھنؤ۔

قیمت: ۱۰۴/روپے

سرسید احمد خاں: (وضاحتی موضوعاتی کتابیات، جلد اول)، ڈاکٹر عطا خورشید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ قیمت: ۵۰۰/روپے

سقوط ماسکو اور ترقی پسند ادب: ڈاکٹر عطا عابدی، بک امپوریم، پٹنہ۔ قیمت: ۴۰۰/روپے

قوت تعلیم افکار و نظریات: ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی، دکن ٹریڈرس، چار مینار، حیدرآباد۔

قیمت: ۴۹۹/روپے

گیتا حقیقت کے آئینہ میں: وی آر نارلا، مترجم سید شاہد، یونیورسل پیس فاؤنڈیشن، نئی دہلی۔

قیمت: ۹۰/روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	300/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس و دبیر		250/-
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر		100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام		200/-
کلیات شبلی (اردو)		220/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		170/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی		
مقالات شبلی دوم (ادبی)	〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	〃	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول	〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم	〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)		250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
July 2019 Vol - 204 (1)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

مطبوعات شبلی صدی

۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۶۔	حیات شبلی	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۷۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۸۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۹۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۰۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۱۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۲۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۳۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۴۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۵۔	تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۶۔	مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-
۱۷۔	مطالعات شبلی	مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی	550/-
۱۸۔	الفاروق (ہندی)	علامہ شبلی نعمانی	450/-
۱۹۔	الندوہ (جلد ۱۔۹)		4735/-